سُر کی چھایا

(ایک کتھا)

تعارف

(۱)

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیے

غالب کا یہ شعر عموماً غزل پر نظم کی برتری ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے حالانکہ یہاں خیال اور ہیئت کے ناگزیر رشتے کی بات کی گئی ہے۔ ہر سچے فن کار کے ہاں خیال اپنی ہیئت کا تعین خود کرتا ہے۔ جو بات نظم میں کہی جا سکتی ہے وہ نظم ہی میں کہی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی موضوع کے لیے نادل درکار ہے تو کوئی بھی اور صنف اس کے اظہار سے قاصر ہوگی۔ 'کچھ اور چاہیئے وسعت' سے یہ واضح ہے کہ غزل کی یکسر نفی مقصود نہیں۔ شوق کا جو حصہ بیان ہونے سے رہ گیا ہے وہ غزل میں نہیں سمویا جا سکتا۔ اس کے لیے کوئی اور 'ظرف' چاہیئے۔ مختلف اصنافِ سخن وہ امکانی ظروف ہیں جن کے ذریعے خیالات اظہار پا سکتے ہیں۔

ناصر کاظمی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے نظمیں بھی لکھیں اور مضامین بھی اور 'سر کی چھایا' کی صورت میں ایک ڈرامہ تخلیق کیا۔ دراصل ان کا تمام تر تخلیقی سفر نت نئے جہانوں کی جستجو سے عبارت تھا۔

'سر کی چھایا' ہیئت کے اعتبار سے ڈرامہ ہے اور روح کے اعتبار سے شاعری۔

نثر گویا کسی نظم کا بند ہے۔ ہر مکالمہ قافیہ ردیف سے آزاد لیکن کسی نہ کسی بحر کا پابند ہے۔ ہر کردار شروع سے آخر تک ایک مخصوص بحر میں گفتگو کرتا ہے۔ مثلاً مرکزی کردار عبدل کی ہر بات اس بحر میں ہے: فعلاً فعلاً فعلاً فعلاً۔

منظوم ڈرامے پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کی زبان غیر فطری اور مصنوعی، اور امکانات محدود ہوتے ہیں۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ اس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ہر زندہ اور بڑے نثری ڈرامے کے کردار جو زبان بولتے ہیں وہ عام زندگی میں بولی جانے والی زبان سے اتنی ہی مختلف ہوتی ہے جتنی کہ نظم۔ نظم کی طرح یہ بھی بار بار لکھی گئی ہوتی ہے۔ ادیب اپنے اردگرد بولی جانے والی زبان میں سے بہت کچھ مسترد کرتا ہے اور جو کچھ چنتا ہے اسے بھی ایک خاص ترتیب دیتا ہے۔ اس سلسلے میں کئی نئے الفاظ تخلیق کرتا ہے۔ گویا ادب کی زبان بہت زیادہ نتھری اور منجھی ہوئی ہوتی ہے۔ سان او کیسے (SEAN O'CASEY) کہتا ہے کہ اگر گلی یا ڈرائنگ روم میں بولا جانے والا کوئی مکالمہ ہو بہو کسی ڈرامے میں شامل کر دیا جائے تو نتیجہ نہایت مضحکہ خیز اور بھونڈا ہوگا۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس ادبی کلام — (ARTSPEECH) اور روزمرہ بول چال (CONTEMPORARY SPEECH) میں تفریق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ صرف ادبی کلام ہی کلام کہلانے کا مستحق ہے۔ (ART SPEECH IS THE ONLY SPEECH)۔

دنیائے ادب کا مطالعہ لارنس کی اس بات کی تائید کرتا ہے۔ مثلاً، اگر ہم شیکسپیئر کے کسی ہم عصر کو پڑھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اس کی زبان شیکسپیئر سے کتنی مختلف ہے۔ اس کے ہم عصر حقیقت نگاری کے شوق میں اپنی ہمعصر زبان لکھتے رہے۔ اسی لیے زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ ان کی تحریریں غیر مقبول اور غیر معروف ہوتی گئیں۔ زبان تو سدا ارتقائی منازل میں رہتی ہے۔ وقت کی کسوٹی پہ وہی تحریر پوری اترتی ہے جو تخلیقی ہو۔ اگر اس زاویے سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ نثری ڈراموں کی نثر بھی ایسی ہی مصنوعی ہوتی ہے جیسی کہ نظم یا صورت

دیگر نظم بھی ایسی ہی فطری ہو سکتی ہے جیسی کہ نثر۔ البتہ شاعری کو ڈرامے کا ذریعہ بنانے کے ضمن میں ایلیٹ نے ایک تنبیہہ بھی کر رکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر شاعری سجاوٹ کے لیے ایک اضافی سامانِ آرائش کے طور پر استعمال ہو یا صرف اس لیے کہ ادبی ذوق کے لوگوں کو ڈرامہ دیکھتے وقت شاعری سننے کا لطف بھی فراہم کیا جائے، تو یہ بالکل بے جا ہو گی۔ اسے محض شاعری کی ڈرامائی تشکیل ہونے کی بجائے ڈرامائی حیثیت میں اپنا جواز پیش کرنا چاہیئے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسا کوئی ڈرامہ منظوم نہیں ہونا چاہیئے جس کے لیے نثر ڈرامائی طور پر موزوں ہو۔

منظوم ڈرامے کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نثر بہت سے جذبات اور احساسات کے اظہار سے قاصر ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہیں کبھی ایسی صورتحال کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو جب 'ہمارے' الفاظ مافی الضمیر کے اظہار کے لیے بایوس کن حد تک ناکافی نظر آتے ہیں۔ ہر وہ شخص جسے کبھی اپنے کسی عزیز کو تعزیتی خط لکھنا پڑا ہو، اس بات سے بخوبی واقف ہو گا۔ 'ہماری' زبان کی بے چارگی اس وقت بھی سدِ راہ بنتی ہے جب ہمارا سامنا عظیم الشان حسن، کراہت انگیز بدصورتی، شدید تکلیف، غیر معمولی اچھائی یا خوفناک عیاری سے ہوتا ہے۔ ہم میں سے بیشتر نے دیکھا ہو گا، اگر محسوس نہیں کیا کہ شدید غصے یا رنج کے عالم میں کچھ نہ کہہ سکنے کی بے بسی، دم گھٹنے کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور خوشی اتنی بلندیوں کو چھو سکتی ہے کہ ہم الفاظ نہ ملنے کے باعث رو پڑتے ہیں۔ اس قسم کی صورتِ حال میں صرف شاعری ہی جذبے کا کچھ اظہار کر پاتی ہے کیونکہ شاعری روزمرہ زبان کی بہ نسبت ہماری داخلی سچائی کے قریب تر ہوتی ہے پس شاعری انسانی روح کی ایک مستقل خواہش اور ضرورت ہے اور ڈرامے کا ایک فطری ذریعہ۔

(۲)

پھر کئی لوگ نظر سے گذرے
پھر کوئی شہرِ طرب یاد آیا

ڈرامے کا ڈھانچہ کچھ اس طرح سے ہے کہ زیادہ تر مناظر کرداروں کے ماضی سے متعلق

ہیں۔ پہلا منظر گاڑی کے ایک ڈبے کا اندرونی منظر ہے۔ احمد، فیاض اور مولوی صاحب باتیں کر رہے ہیں۔ مرکزی کردار عبدل ایک طرف بیٹھا ہے۔ اس کا آبائی گاؤں سورج پور جو احمد اور فیاض کی منزل ہے، راستے میں پڑتا ہے۔ وہ عبدل کو نہیں پہچانتے مگر ان کی باتیں سن کر عبدل انہیں پہچان جاتا ہے۔ فیاض اس کے بچپن کا ساتھی ہے اور احمد اس کے دوست اکبر کا کاروبار میں حصہ دار ہے۔ اپنی محبوبہ نندی سے آخری ملاقات اس کی آنکھوں میں پھر جاتی ہے :

— — — — — — — —

کہاں ہو نندی ؟ یاد ہیں وہ دن؟
جب ہم چھوٹے چھوٹے سے تھے!

— — — — — — — —

مَیں اور حسنی کھیل رہے تھے !!

اگلے پانچ مناظر عبدل کی یادوں کا حصہ ہیں۔ دوسرا منظر ۲۴ برس پہلے بچپن کا ہے اور باقی چار نوجوانی کے دور کے۔ ساتواں منظر ہمیں پھر ریل کے اندر لے آتا ہے۔ عبدل کھڑکی کے پاس بیٹھا سوچ رہا ہے۔ احمد اور فیاض دوسری طرف بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ پہلے فیاض اپنے حافظے سے کچھ باتیں بیان کرتا ہے اور پھر احمد :

مَیں نے وہ رات دیکھی ہے جب آسمان سرخ تھا

اگلے پانچ مناظر احمد کی یادوں پر مشتمل ہیں جو اس ترتیب سے پیش کی گئی ہیں کہ کہانی مکمل طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ آخری منظر پھر ریل گاڑی کا ہے۔ رات گہری ہو چکی ہے۔ سورج پور بہت نزدیک آچکا ہے۔ احمد اور فیاض بدستور باتیں کر رہے ہیں عبدل گہری سوچ میں سر جھکائے بیٹھا ہے۔ اسے طرح طرح کے خیال آوازیں دیتے ہیں۔ اچانک گاڑی رُک جاتی ہے، فیاض پہلی بار عبدل سے مخاطب ہوتا ہے۔

کونسا اسٹیشن ہے بھائی ؟

آپ یہاں اتریں گے صاحب ؟

احمد: نہیں ! یہ تو جنگل ہے !

— — — — — — —

(۳)

کہتے ہیں کشمکش ڈرامے کی جان ہے۔ 'سُر کی چھایا' میں داخلی اور خارجی دونوں طرح کی کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ خارجی کشمکش پھر دو طرح کی ہے : فرد کی فرد کے خلاف جیسے عبدل اور بلبے کی اور پھر حسنی اور بلبے کی کشمکش بلکہ چپقلش دوسری ' فرد اور معاشرے کی باہمی کشمکش جس کا شکار عبدل، نندی اور حسنی ہوتے ہیں۔ لیکن 'سُر کی چھایا' بنیادی طور پہ داخلی کشمکش کا ڈرامہ ہے۔ عبدل اس کا شکار پہلی بار اس وقت ہوتا ہے جب لوگ جنگل کو آگ لگا دیتے ہیں

ع نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن .

— — — — — — — —

بولو نندی کہاں چھپی ہو ؟

باہر جاؤں !

لیکن نندی

نندی مر جائے گی عبدل

— — — — — — — —

اگلے منظر میں جب عبدل چھپتا چھپاتا گھر آتا ہے اور اپنے ماں باپ کی گفتگو سنتا ہے تو ایک نئی کشمکش میں پھنس جاتا ہے۔ 'کبھی وہ بوڑھے ماں باپ کی طرف دیکھتا ہے کبھی بدنامی کا ڈر اسے ستاتا ہے۔ نندی کے بعد وہ اب گاؤں میں ٹھہرنا نہیں چاہتا۔'

آواز : وہ رہا ہے !

راتوں رات نکل جا عبدل !

عبدل : لیکن یہ میرا گھر !

یہ میرے ماں باپ !

کہاں جاؤں گا ؟

ندی ! میرے ارمانوں کا آخری سنگم

آواز : اب اس پیڑ سے اڑ جا

اس کی جڑیں اب سوکھ چکی ہیں

—·— — — — — —

——— — — — — —

اس کے بعد عبدل ساتویں منظر میں نظر آتا ہے ۔ وہی پہلا گاڑی والا منظر ۔ اب وہ ایک نئی کشمکش میں مبتلا ہے ۔ سورج پور، اس کی مٹی، اس کا گاؤں، راستے میں پڑتا ہے :

ایک کرن پھر وقت کی سیڑھی سے اُتری ہے

لیکن میں تو — اس دھرتی میں میرا کوئی نہیں ہے

سات برس کے بعد یہاں سے پھر گزرا ہوں

وہی پہاڑ اور وہی نظارے !

اس وادی میں کیسے اتروں !

اس دھرتی سے میرا ناطہ ٹوٹ چکا ہے ۔

اپنے وقت کا اک اک ساتھی چھوٹ چکا ہے

آخری منظر میں عبدل کی کشمکش اور ذات کی تقسیم اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے ۔ اُسے طرح طرح کے خیال آوازیں دیتے ہیں اور وہ باری باری ان کا جواب بھی دیتا ہے ۔ 'آواز' کی 'تجاویز' یا 'آراء' کے حق میں یا خلاف فیصلے بھی کرتا ہے ۔

آواز :- سورج پور اترو گے عبدل ؟

وہاں نہ جانا !

وہاں تیرا اب کوئی نہیں ہے !

عبدل :۔ اس دھرتی سے میرا ناطہ ٹوٹ چکا ہے ۔

آواز : تو نے نندی کو مارا ہے !

تو نے اس کا خون پیا ہے !

تو نے حسنی کو مارا ہے !

تو اپنے ماں باپ کا قاتل

تو ہی بلبے کا قاتل ہے ۔

اتنے تن داروں کا خون تیری گردن پر !

تو خونی ہے !

تو قاتل ہے !

عبدل : تو جھوٹا ہے

نندی اپنی موت مری ہے

حسنی میرا جگری دوست تھا

آواز : تو بزدل ہے !

تو نے سورج پور کو اجاڑا

عبدل : تو جھوٹا ہے !

تو بزدل ہے !

اس کے علاوہ ہمیں ایک اور کشمکش کا سراغ بھی ملتا ہے ۔ وہ ہے طبقاتی کشمکش ۔
چھٹے منظر میں عبدل کی ماں نصیبن، جب اپنے بیٹے کی جان کے بارے میں متفکر ہوتی ہے تو

نہایت بے بسی اور غصّے کے عالم میں کہتی ہے۔

نہ ہوا اس وقت میری ماں کا جایا
دیکھ لیتی ان زمینداروں کا مان
میرے بیٹے کو اگر کچھ ہو گیا تو شیر مے پی لوں گی ان کے!

پھر آٹھویں منظر میں احمد چکی کی آواز سن کر کہتا ہے۔

یہ آٹے کی چکی ابھی تک یونہی چل رہی ہے
یہ چکی میں کیا پس رہا ہے؟
... مگر گاؤں بھر میں دہائی مچی ہے کہ آٹا نہیں
کال ہے، لوگ مر جائیں گے۔
لوگ بھوکوں مرے جا رہے ہیں

— — — — — —

— — — — — —

یہ سب نفع خوروں کی سازش ہے
غلّے کا توڑا نہیں!
اپنے کھیتوں کو دیکھو!
ذرا اپنی فصلوں کو دیکھو!
ہری ہیں، بھری ہیں!
مگر یہ زمیندار، یہ کالی منڈی کے تاجر!

(۴)

سوائے عبدل کے سبھی کردار TYPES ہیں۔ نندی روایتی محبوبہ ہے جس کے ایک

طرف عاشق کی محبت ہے اور دوسری طرف گھر والوں کی عزت۔ محبوب سے ملنے کی شدید خواہش بھی ہے اور ظالم سماج، کا زبردست خوف بھی جس کی نمائندگی اس کا بھائی بلھا اور اس کے ساتھی کرتے ہیں۔ عبدل کے ماں باپ روایتی ماں باپ ہیں جنہیں اپنی اولاد کے دلوں سے زیادہ لوگوں کی زبانوں کا خیال ہوتا ہے۔ احمد حسنی اور اکبر افسانوی دنیا کے جاں نثار ساتھی ہیں۔

ان سب کے برعکس عبدل دنیائے ادب کے بیشتر رومانوی مرکزی کرداروں سے مختلف نظر آتا ہے، مثلاً نندی کو کھو دینے پر نہ تو وہ فرہاد کی طرح سر پھوڑتا ہے نہ مجنوں کی طرح دیوانہ ہو جاتا ہے نہ رومیو کی طرح زہر پیتا ہے نہ ورتھر کی طرح اپنی کنپٹی میں گولی اتارتا ہے۔ جب جنگل میں آگ لگتی ہے اور نندی بچھڑ جاتی ہے تو عبدل اسے ڈھونڈنے کی سر توڑ کوشش کرتا ہے لیکن جلد ہی اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ کامیابی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اس کے اندر سے آواز آتی ہے۔

الٹے پاؤں ہٹ جا عبدل
نندی اب نہ ملے گی
اس کی قسمت میں جلنا ہے
الٹے پاؤں ہٹ جا!

اس کا پہلا ردعمل اس کے خلاف ہوتا ہے اور بڑا شدید:

لیکن نندی! اسے اکیلا چھوڑ کے جاؤں!
نہیں نہیں میں جل جاؤں گا!
جل جاؤں گا!
جل جاؤں گا!

لیکن پھر اس کے اندر کا حقیقت پسند انسان اسے سمجھاتا ہے:

آگ کسی کی میت نہیں ہے
اپنی جان بچالے عبدل!
ندی اب نہ ملے گی
اندھی آگ کا رستہ چھوڑ کے راتوں رات نکل جا پیارے
وہ رستہ ہے!

اور بالآخر عبدل یہ مشورہ قبول کرلیتا ہے اور دل پہ پتھر رکھ کے 'وہ رستہ' اختیار کرلیتا ہے

؎ ناصر یہ وفا نہیں جنوں ہے
اپنا بھی نہ خیر خواہ رہنا

اس کے بعد جب 'آواز' اسے قائل کرلیتی ہے کہ اب اس کے 'پیڑ' کی جڑیں سوکھ چکی ہیں، اس کے 'پھل' کو اندر سے 'کیڑوں' نے چاٹ لیا ہے اور اب اس میں کبھی 'رس' نہیں پڑے گا تو وہ گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کرلیتا ہے اور 'کڑوے نیم کی ٹہنی' چن لیتا ہے۔

سات برس گزر جانے کے بعد بھی اگرچہ اسے ضمیر کی خلش کبھی کبھی تنگ کرتی ہے لیکن اسے یقین ہے کہ نہ تو اس نے بے وفائی کا مظاہرہ کیا تھا نہ بزدلی کا۔ آخری منظر میں جب 'آواز' اسے ملامت کا نشانہ بناتی ہے تو وہ اپنا پورا پورا دفاع کرتا ہے۔

(۵)

ریل کے منظر کے علاوہ 'سر کی چھایا' کے تمام مناظر 'سورج پور' یا اس کے گرد و نواح کے ہیں اور سورج پور ایک گاؤں ہے۔ چنانچہ ہمیں ہر وہ بات نظر آتی ہے جو دیہاتی زندگی اور ماحول میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً، مویشی، کنواں، رہٹ، حقہ، ندی، مرچوں کے کھیت، سرسوں کی پھلی، کیکر، املی، بڑھ، پیپل اور نیم کے درخت، دھوپ، چھاؤں، تنبورہ،

اِک تارہ، ناچ کتھا، میلے ٹھیلے، لوگوں کی سادگی، قناعت، ضعیف الاعتقادی، قسمت پر یقین وغیرہ وغیرہ۔ لیکن سب سے زیادہ لائقِ توجہ جانور اور پرندے ہیں۔ مضافات میں پائے جانے والے تقریباً تمام چوپائے اور پرندے موجود ہیں اور بعض تو باقاعدہ کرداروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسرے منظر کے آغاز میں کرداروں کی فہرست یوں ہے:

پپو۔ (عبدل) عمر ۶ سال

گڈی۔ (حسنی) عمر ۸ سال

کٹو۔ گلہری

۔۔ بندر

بلہا۔ سورج پور کے نمبردار کا لڑکا عمر ۹ سال

نندی۔ بلہے کی بہن عمر ۶ سال

منظر کے دَوران میں کٹو کیکر کے تنے پر سے بار بار اترتی ہے، سڑک کے درمیان تک آتی ہے، پھر بندروں کے ڈر سے یا کوئی آہٹ سن کر لوٹ جاتی ہے۔ اور اس منظر کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے: ' بلہا نندی کا ہاتھ پکڑ کر جلدی سے گذر جاتا ہے اور کٹو پھر واپس کیکر کے تنے پر چڑھ جاتی ہے۔ بندر شور مچاتے ہیں'۔

تیسرے منظر کے کرداروں میں گھوڑا اور بیل بھی شامل ہیں اور باقاعدہ مکالمہ بھی کرتے ہیں۔ ناچ کتھا میں بندو ساز چھیڑتا ہے اور حسنی ناچنے لگتا ہے۔ ہرنوں کی ایک ڈار چوکڑیاں بھرتی ہوئی گذر جاتی ہے۔

چوتھے منظر میں ' عبدل سامنے ایک کیکر کے درخت پر گرگٹ کو کنکر مارتا ہے' پھر نندی اور عبدل کے مابین جو مکالمہ ہوتا ہے اس میں اُلّو، نیل کنٹھ، چوہے، کالے ناگ، بھیڑوں اور اونٹوں کا ذکر آتا ہے اور فاختہ تو خاصی دیر موضوعِ گفتگو بنی رہتی ہے۔

ساتویں منظر میں بھوکی گائیں اور ان کے دودھ سے خالی تھن عبدل کے خیال میں

آتے ہیں۔ آٹھویں منظر میں حسنی کے گیتوں میں کونج، چیل، بلبل، بتوریوں اور چڑیوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اکبر جنگلی کبوتروں کی ٹکڑیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور بندو اُلّو کی آواز کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے۔

یہ پرندے، جانور اور درخت محض پرندے، جانور اور درخت ہی نہیں ہیں۔ جاندار ہونے کی حد تک ان کا درجہ انسانوں سے کچھ کم نظر نہیں آتا۔ مثلاً، ساتویں منظر میں فیاض کا کہنا:

ہاں کچھ ایسا ہی قصہ ہے
گھوڑ سواری کھیل نہیں ہے
اپنے پاس بھی دو گھوڑے ہیں
مَیں نے انہیں بچوں کی طرح سے پالا ہے

یا جیسے آٹھویں منظر میں حسنی گاتا ہے ؎

چڑیاں ترسیں گھونٹ کو دھرتی دھول اڑائے
تم رہو اس دیس میں ہم سے رہا نہ جائے

پھر بعض کو تو عام سطح سے کچھ بلند تر مقام دیا گیا ہے۔ مثلاً چوتھے منظر میں فاختہ کے بارے میں نندی کہتی ہے:

امی کہتی تھیں یہ اک مقدس پرندہ ہے اس کو نہیں مارتے!

اور آٹھویں منظر میں جب اکبر کبوتروں کو مارنے کی بات کرتا ہے تو بندو کہتا ہے:

بڑا ہی بھولا پنچھی ہے یہ سیّد اس کی ذات
بھرے کمے مت مارو اس کو مانو میری بات

یا ساتویں منظر کا یہ مکالمہ:

فیاض: گھوڑا تو بس قسمت والے کو ملتا ہے

اس کے کانوں سے جنت کی ہوا آتی ہے
اس کی ٹاپ سے دھرتی کا دل کانپ اٹھتا ہے

احمد: مگر کالے گھوڑے کی کیا بات ہے
تم نے دیکھا ہے شاید وہ گھوڑا
وہی کالا گھوڑا!
وہ گھوڑا نہیں آدمی ہے!

اس کے علاوہ کچھ کو مبارک یا منحوس بھی گردانا گیا ہے۔ ساتویں منظر ہی میں احمد کہتا ہے: میرے پاس بھی ایک چینا ہے
اس میں بڑا دم ہے بھائی!
بڑا ہی مبارک ہے یہ چینا گھوڑا
مرے پاس جس دن سے ہے یوں سمجھ لو کہ بس لکشمی آگئی

آٹھویں منظر میں حسنی گاتا ہے:

ایک کونج میں ایسی دیکھی اڑے چھوڑ کے ڈار
سانجھ بھئے جس دیس میں اترے وہاں نہ ہو اجیار

پھر اتو کی آواز سن کر بندو کہتا ہے:

یہ بولے جس گاؤں ماں پھر نہ بسے وہ گاؤں
یار واب نئیں بولنا یہاں کسی کا ناؤں

اور گھوڑوں کی باتیں کرتے ہوئے احمد یہ بھی کہتا ہے:

بعض گھوڑا تو سچ مچ ہی منحوس ہوتا ہے

پرندوں اور جانوروں کے ساتھ ساتھ درخت بھی جاندار اور بعض انسانی خصوصیات

کے حامل نظر آتے ہیں۔ مثلاً چوتھے منظر میں نندی کہتی ہے۔

شام کی خامشی میں درختوں پہ کنکر نہیں مارتے
شام کو پیڑ آرام کرتے ہیں عبدل

اور عبدل کہتا ہے: وہ املی کا درخت ابھی تک اسی طرح خاموش کھڑا ہے۔

یہ درخت ان کی یادوں کا محافظ اور محبت کا گواہ ہے۔ اس کے برعکس پیپل کا یہ درخت مخالف کی صورت میں نظر آتا ہے:

عبدل: اس تالاب کے پیپل کے نزدیک نہ جانا!

یہ سب کچھ ایسا بے معنی اور بے سبب بھی نہیں۔ جغرافیائی حالات انسانی زندگی پر بے حد اثر انداز ہوتے ہیں۔ کسی خاص قسم کے علاقے میں رہنے والے لوگوں کی بہت سی آسائشیں اور مشکلیں محض اس وجہ سے ہوتی ہیں کہ وہ اُس خاص علاقے میں رہتے ہیں۔ یہ وہ حالات ہوتے ہیں جن کے ہونے یا نہ ہونے پر نہ صرف یہ کہ انسان کا اختیار بہت کم ہوتا ہے بلکہ یہ اس کی مرضی کے خلاف اس کی زندگی پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ انسان بے پناہ محنت اور توجہ سے ایک کام کرتا ہے مگر کوئی معمولی سا واقعہ یا حادثہ سب کئے کرائے پر پانی پھیر دیتا ہے ؎

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

گویا فطرت میں انسان کی موافق اور مخالف دونوں طرح کی قوتیں کارفرما ہیں منصوبہ بندی کرتے وقت ان کا خاص دھیان رکھنا چاہیئے۔ پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ موافق قوتیں مخالف قوتوں میں بدل جائیں۔ ایسا یا تو انسان کی اپنی کوتاہی سے یا باہر کے حالات میں یکدم اور بعض اوقات بڑے پیمانے پر تبدیلی آنے کے باعث ہوتا ہے۔ مثلاً، زندگی کرنے کے لیے 'سورج پور' ایک مثالی گاؤں تھا۔ عمدہ فصلیں، صحت مند مویشی، گھنا جنگل، بھرپور ندی، غرض جو چاہیئے سو تھا۔

مگر جیسا کہ آخری منظر میں فیامن کی زبانی پتہ چلتا ہے :

سات برس میں اس دھرتی کی ایسی کایا پلٹی !
پہلے جنگل راکھ ہوا ، پھر کال پڑا
سیلاب تو بس ایسا آیا کہ توبہ میری !

دیہاتی ماحول کے ضمن میں ایک اور قابلِ توجہ بات دیہاتی زبان ہے۔ مشرقی پنجاب کے شہروں، انبالہ اور پٹیالہ اور گرد و نواح میں بولی جانے والی زبان 'سُرکی چھایا' میں کئی جگہ استعمال کی گئی ہے۔ مثلاً پہلے منظر میں ایک اسٹیشن پر ملی جلی آوازیں :

بیرا گڈی چلنے لاگی دوڑ کے آجا
تیرا ٹکس کہاں ہے ؟
چھجو چاچا میرا بکسا کھڑکی ماں تے پھینک دے جلدی
اچھا اللہ بیلی بیرا !
ہو ! چھٹی استابی پا ئیے !

تیسرے منظر میں کورس کی آواز :

اس بانکے رے ترچھے گھونگھٹ ماں تو ں سارے جگ تے نیاری دیکھے

پھر ایک آواز: میتھے پر جھمر لشکاں مارے مانگ ماں چمکیں ٹوماں

دوسری آواز: سارا گاؤں دہائیاں دیوے سہرماں پڑگئیں دھوماں

پھر عورت کا کہنا: ہٹ دور پرے کل موئے
تو میرا جوبن چھوئے
تیری آنکھیوں ماں ڈالوں سوئے
کل موئے

بیل اور گھوڑے کا تمام تر مکالمہ اسی زبان میں ہے۔ بند و از اول تا آخر یہی زبان بولتا ہے

اور کہیں کہیں حسنی اور بلھا بھی۔ نویں منظر میں 'ناری' سے اور دسویں منظر میں بلھے سے حسنی کے مکالمے زیادہ تر اسی زبان میں ہیں۔

(۶)

اڑ گئے شاخوں سے یہ کہہ کر طیور
اس گلستاں کی ہوا میں زہر ہے

ہجرت 'سُر کی چھایا' کا ایک اہم موضوع ہے۔ ناموافق حالات میں انسان نقل مکانی کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ جیسے آٹھویں منظر میں حسنی کہتا ہے:

چڑیاں ترسیں گھونٹ کو دھرتی دھول اڑائے
تم رہو اس دیس میں ہم سے رہا نہ جائے

لیکن ایسی صورتِ حال بھی پیدا ہو سکتی ہے جب عافیت اور بقا کا واحد راستہ ہجرت ہی ہوتا ہے۔ چھٹے منظر میں 'آواز' کہتی ہے:

وہ رستہ ہے!
راتوں رات نکل جا عبدل!

لیکن برسوں کے رشتوں کو یکدم توڑ دینے کا تصور بھی جانکاہ ہے۔

عبدل: لیکن یہ میرا گھر!
یہ میرے ماں باپ!
کہاں جاؤں گا؟
نندی میرے ارمانوں کا آخری سنگم!

اب 'آواز' مدلل طریقے سے عبدل کو قائل کرنے کی کوشش کرتی ہے:

اب اس پیڑ سے اُڑ جا

اس کی جڑیں اب سوکھ چکی ہیں
اس کے پھل کو اندر سے کیڑوں نے چاٹ لیا ہے۔
ہوا چلے یا پانی بہے
اب اس پھل میں رس نہ پڑے گا
چاند کی کرنیں دستک دے کر
الٹے پاؤں پلٹ جائیں گی
چھلکا پیلا پڑ جائے گا
اب اس پیڑ سے اڑ جا
دور کسی جنگل میں ڈال بسیرا
کڑوے نیم کی ٹہنی چن لے

'پیڑ' خاندان اور گھر کی علامت ہے جس کی جڑیں (گاؤں سے رشتہ) سوکھ چکی ہیں۔ اس ے پھل (مستقبل) کو کیڑوں نے ایسے کھوکھلا کر دیا ہے کہ اب کسی 'ہوا' یا 'پانی' سے اس میں رس' نہیں پڑ سکتا۔ 'چاند کی کرنیں' ہمدرد اور تعمیر میں مدد قوتیں ہیں جو آئیں گی ضرور لیکن یوس ہو کر لوٹ جائیں گی جیسے کسی لاعلاج مریض کو دیکھ کر طبیب۔ چھلکا یعنی ظاہری روپ رفتہ رفتہ ماند پڑ جائے گا۔ چنانچہ اب اپنے گاؤں میں عبدل کے پنپنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اب ب ہے اسے دور کسی جنگل میں بسیرا ڈالنا پڑے سوچ پورے بہر طور نکلنا ہوگا۔ پھل دار درخت چھوڑنا ہوگا چاہے آشیانہ کڑوے نیم کی ٹہنی پر بنانا پڑے۔ حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا اگرچہ ی تلخ ہے۔

ہجرت ہی کے ضمن میں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ بعض اوقات انفرادی اور اجتماعی رقی اور تعمیر کے لیے ہجرت ضروری ہوتی ہے۔ مثلاً پہلے منظر میں احمد اور فیاض کا یہ مکالمہ:

احمد: (فیاض سے)

آپ بھی اب نویں شہر میں گھر بنالیں
بڑی خوبصورت جگہ ہے

فیاض: جی ہاں! اپنا ارادہ تو پکا ہے
پھول گلی میں پچھلے برس دو قطعہ زمین لیے تھے۔
اب تو نیویں کھدنے لگی ہیں۔
اللہ کو منظور ہوا تو گھر بھی جلدی بن جائے گا!

احمد: اب تو چاروں طرف سے وہاں لوگ بسنے لگے ہیں
نئی طرز کی کوٹھیاں بن رہی ہیں
کھلی صاف شیشہ سی سڑکیں ہیں
سڑکوں کے دونوں طرف سنگتروں کے درختوں کا ایک سلسلہ ہے۔

یہی احمد سات برس پہلے (آٹھویں منظر میں) نقل مکانی کی آرزو کرتا ہے مگر حالات اجازت نہیں دیتے: چلو شہر میں چل کے ڈیرہ لگائیں
مگر بھائی ہم تو پنہ گیر ہیں
شہر میں کیا کریں گے؟
وہاں ان دنوں کام ملنا بھی مشکل ہے
اپنا کوئی یار ڈپٹی کلکٹر ہی ہوتا
نہیں یار اب تو یہیں مر رہیں گے
اسی گاؤں میں گھر بنائیں گے
اب تو یہی تھل بسائیں گے

اب یہی احمد 'پرانی' جگہ کو چھوڑ کر 'نویں' شہر میں ایک بہت بڑی حویلی میں رہ
ہے۔ اس کے برعکس حشمت، نصیبن اور بلھے کے ماں باپ جنہوں نے تعصب آمیز محبت کی د

سے گاؤں چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا، سیلاب میں بہہ گئے۔ آخری منظر میں فیاض اور احمد کا یہ مکالمہ ان کے رویے پر تبصرہ کرتا ہے:

فیاض: بندو اور میں کشتی لے کر سب سے پہلے عبدل کے ڈیرے میں پہنچے
حشمت باوا اور نصیبن گھر سے نہ نکلے

احمد: مَیں بھی اس رات اکبر کو لے کر گیا تھا مگر وہ نہ مانے!
اجی یہ پرانے زمانے کے بوڑھے کسی کی نہیں مانتے
خیر اچھے تھے وہ لوگ!
دنیا میں اب ایسی شکلیں کہاں ہیں؟

(۷)

پھر درد نے آگ راگ چھیڑا
لوٹ آئے وہی سمے پرانے

آگ 'سر کی چھایا' کی نمایاں ترین مخصوصیات میں سے ایک ہے۔ کبھی یہ شدید گرمی کی شکل اختیار کرتی ہے، کبھی کڑی دھوپ کی، کہیں یہ نفرت کا شعلہ ہے، کہیں حسد کا دھواں، کبھی وصال کی آنچ اور کبھی فراق کی سوزش۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جس گاؤں کی یہ کہانی ہے وہ 'سورج پور' ہے۔ موسم گرمیوں کا ہے۔ پہلے منظر کے آغاز ہی میں احمد فیاض سے کہتا ہے:

دیکھئے نا اُدھر کس قدر دھوپ ہے!
آپ اِدھر میرے نزدیک آجائیں

پھر تھوڑی ہی دیر بعد کہتا ہے:

چار دن کتنی جھڑیاں لگیں پھر بھی گرمی کی شدت وہی ہے!

باتوں باتوں میں سورج پور کا ذکر آتا ہے تو سات برس پرانی آگ اور گاؤں کی بربادی کا تذکرہ ہوتا ہے۔ عبدل سوچتا ہے: . . . . . .

سورج پور اب بھی نہ بسے گا
سورج پور! . . . وہ آگ کی نگری!
وہ اندھیاری رات . . . وہ جنگل!

چوتھے منظر میں زرینہ کا گانا سن کر یاسمینہ کہتی ہے:

اچھا جی اب مَیں سمجھی!
تو بھی جلی ہوئی ہے

پھر عبدل کہتا ہے: . . . . . .

ریت کے تارے آگ کی ہولی کھیل رہے ہیں

پانچواں منظر تو ہے ہی آگ کا منظر۔ سات برس پہلے والا۔

عبدل: کیسے بجھاؤں؟
آگ ۔ آگ۔ آگ
چاروں جانب آگ کا دریا

.. ..

آواز: آگ کسی کی میت نہیں ہے

.. ..

چھٹے منظر میں جنگل کی آگ کے شعلے ابھی تک بھڑک رہے ہیں . . . .

آٹھویں منظر میں: . . . الاؤ کی آگ بھڑک رہی ہے، حسنی گاتا ہے:

رنگ برنگے گربڑے آگ کے پنکھ لگائے
گھپ اندھیری سانجھ ماں کس نے یہاں اڑائے

نویں منظر میں آگ اندر کی آگ بن جاتی ہے:

بھابنڑ جلے سر یہ ماں رنگ اچھالیں نین
من دیپے جس رین ماں میہی نہ ہو وہ رین

یا حسد کی آگ: دھرتی اوپر نیلا گگن، گگن پہ ناچیں پھول
ان کی چھایا دیکھ کے جل میں جلیں ببھول

مگر کچھ ہی دیر بعد آگ اپنی اصل صورت میں سامنے آجاتی ہے:

احمد: ارے وہ اُدھر آگ!
اس آگ کے پاس... اک آدمی زاد!

.. ..

حبشی: دہڑ دہڑ جلے سوکھی لکڑی جگر جگر انگار
آگ کی اٹھتی لاٹ سے نکلیں سرخ انار

یہ آگ ناری کا پردہ بھی ہو سکتی ہے اور دفاع بھی:

اگنی برن کی اوٹ ماں، اپنا بدن چھپا
او ناری او مورکھ ناری اپنا ناؤں بتا

پھر عذاب کی شکل بھی ہو سکتی ہے:

ناری: .. ..
بجلی پڑے ان [illegible] پہ، تم پہ پڑو انگار

یہ منظر جب ختم ہوتا ہے تو آگ کے شعلے آسمان تک بلند ہو رہے ہیں...؛

دسویں منظر میں بھی چاروں طرف سے جنگل دہڑ دہڑ جلتا ہے۔ پھر جب احمد پوچھتا ہے

آگ کس نے لگائی تھی بھائی!

ملا کچھ پتہ ؟

تو ذہن میں یہ سوال بھی ابھرتا ہے کہ فساد کی جڑ کون ہے ؟ اصل قصور کس کا ہے ؟

گیارہویں منظر میں آگ تعمیری کام کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔ یہاں وہ انسان کی مطیع اور دوست ہے :

شیشہ گر: .. ..

یہ چمنی ہے! چمنی میں ایندھن جلتا ہے۔

ایندھن کوئلے کا ہوتا ہے ۔ لکڑی اور پتھر کا کوئلہ !

یہ بھٹی ہے ! بھٹی میں شیشہ پگھلتا ہے اور سانچوں میں گرتا رہتا ہے۔

.. ..

بارہویں منظر میں گرمیوں کی دوپہر ہے اور 'عورت' کا گانا 'آگ' سے معمور ہے :

کنچن روپ دکھائے

سرگم سا (سارے گاما سا)

جل میں آگ لگائے

چھم چھم ناچے کھڑی دوپہری

دھوپ کی تانیں گہری گہری

سرگم سا

جل میں آگ لگائے

.. ..

اور جب اکبر کہتا ہے : ہمارے مفتی گذر گئے ہیں

یہ آخری شمع رہ گئی تھی

تو آگ ٹھنڈک اور روشنی کا تاثر لیے ہوئے ہے۔

(۸)

چڑھتے سورج کی ادا کو پہچان

ڈوبتے دن کی ندا غور سے سُن

یہ شعر ناصر کاظمی کی جس غزل کا ہے، انہیں اس قدر پسند تھی کہ جب ان کے آخری انٹرویو میں ان سے شعر سنانے کی فرمائش کی گئی تو انہوں نے اس کا انتخاب کیا۔ کہا کہ "بعض وجوہ کی بنا پر مجھے پسند ہے کہ طلوع و غروب کے مناظر ہیں۔ حیرت و عبرت کہ دنیا میں کیا ہوتا ہے کس طرح چیزیں ڈوبتی ابھرتی ہیں۔ کس طرح صبح شامیں ہوتی ہیں . . ."

اتفاق کی بات ہے کہ 'سر کی چھایا' میں بھی یہ طلوع و غروب اور چیزوں کا ڈوبنا ابھرنا ت واضح طور پر دکھائی دیتا ہے جسے رواں دواں لیے جاتا ہے وقت کا دھارا۔

'سر کی چھایا' جس کی ابتدا 'کس قدر دھوپ' اور لوگوں سے بھرپور' بارونق گاؤں میں ہوتی ہے، ایسے مقام پر آکر ختم ہوتی ہے' جہاں بے اختیار یہ شعر یاد آتا ہے۔

جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو   بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

ڈرامے کا آغاز ہی اس جملے سے ہوتا ہے:

'شام کا وقت ہے . . .'

'وقت — ڈھلتا سورج'

جب فیاض پوچھتا ہے 'سورج پور اب تھوڑی دور ہی ہوگا؟' تو احمد کا جواب ہے، 'نہیں گھر پہنچتے پہنچتے ہمیں رات پڑ جائے گی'۔ تھوڑی دیر بعد جب 'گاڑی ایک ننھے سے اسٹیشن پر رک جاتی ہے' تو 'سورج ڈوب رہا ہے'۔ پھر مولوی صاحب باتوں باتوں میں کہتے ہیں:

بتوں کی چاہ گئی ہو برا ضعیفی کا

ادھر تو پک گئے بال اور ادھر سدھارے دانت

اپنا دن ڈوب چکا بابا!

یہاں دن ڈوبنے کے اور معنی ہیں۔

صرف دوسرا اور تیسرا منظر 'دن چڑھے' کا ہے۔ چوتھا منظر پھر شام کا۔

عبدل نندی سے پہلی بات یہی کرتا ہے:

آؤ میں تم کو گھر چھوڑ آؤں

دیکھو سورج کتنا نیچے اتر گیا ہے!

جب اکبر ملتا ہے تو اس کے جملے یہ ہیں:

بڑی اندھیری ہے آج کی شام

آندھی آئے گی

اب شام کے ساتھ ساتھ تاریکی اور آندھی بھی شریک ہو گئی۔ جب گھوڑسواروں کے آنے پر گرد اڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے تو نندی کہتی ہے:

چلو اس بنی کے درختوں میں چھپ جائیں

رات ہو گئی ہے!

پانچواں منظر ایسے شروع ہوتا ہے: 'اندھیرے جنگل میں عبدل نندی کو ڈھونڈتا ہے... ... خاصی رات ہو گئی ہے' چھٹے منظر کا آغاز یہ ہے: 'آدھی رات گذر چکی ہے' ساتواں منظر پھر ریل گاڑی کا ہے اور پہلا جملہ ہے، 'سورج ڈوب رہا ہے' آٹھویں منظر میں بھی 'شام ہو رہی ہے' نواں منظر... 'اندھیری رات ہے۔ سناٹا ایک حادثے کی طرح پھیلتا جا رہا ہے...' دسویں منظر میں 'رات ہو گئی ہے' البتہ گیارہویں منظر میں صبح کا وقت ہے' اور بارہویں میں 'گرمیوں کی دوپہر ہے'۔ آخری منظر کی ابتدا 'رات ہو گئی ہے' سے ہوتی اور انتہا:

کوئی آواز بھی تو نہیں!

کوئی بتی نہیں!

یہ تو جنگل ہے سنسان جنگل!!

ہم نے محفوظ کیا حسنِ بہار
عطرِ گل صرفِ خزاں تھا پہلے

ناصر کاظمی سے ایک بار سوال کیا گیا کہ آپ نے شعر کیوں اور کیسے کہنا شروع کیا تو انہوں نے اس کا ایک سبب یہ بتایا کہ انہیں یوں لگتا تھا کہ جو خوبصورت چیزیں وہ فطرت میں دیکھتے ہیں، ان کے بس میں نہیں آتیں؛ ان کی گرفت سے نکل جاتی ہیں اور ہمیشہ کے لیے چلی جاتی ہیں۔ جو وقت مر جاتا ہے وہ دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ شاعری میں زندہ ہو سکتا ہے۔

دیکھا جائے تو یہ جذبہ ہر تخلیق کے پیچھے کارفرما ہوتا ہے، خواہ شاعری ہو یا نثر، مصوری اور سنگتراشی ہو یا موسیقی۔ جو لمحہ جتنا خوبصورت اور قیمتی ہوگا، اسے پھیلانے اور محفوظ کرنے کی خواہش اتنی ہی شدید ہوگی۔ تخلیق کار کامیاب ہو یا ناکام، اس لمحے کی یاد نہ صرف باقی رہتی ہے بلکہ تڑپاتی رہتی ہے۔ اس لحاظ سے حسن پرستی پر ماضی پرستی کا گمان ہونا کچھ ایسا عجب نہیں۔

ہر ڈرامہ نگار یا ناول نویس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کرداروں کے ذریعے اپنے خیالات، یادوں اور خوابوں کی تشہیر کرنا چاہتا ہے۔ یعنی مخلوق کے پردے میں خالق خود بول رہا ہوتا ہے۔ یہ بات ایک حد تک درست ہے تخلیق کا تخلیق کار سے ایسا ہی تعلق ہوتا ہے جیسا پھل کا درخت سے یا خوشبو کا پھول سے۔ اگر ناصر کاظمی کے ایک اچھے قاری کو مصنف کا نام بتائے بغیر 'سر کی چھایا' پڑھنے کو دی جائے تو وہ جلد ہی جان جائے گا کہ یہ کس کی تخلیق ہے۔ رفتگاں کی یاد، ہجرت کا تجربہ، فراق، اداسی، فطرت سے لگاؤ، جانوروں اور پرندوں سے محبت، سیر و سیاحت، گھوڑ سواری اور موسیقی کا شوق وغیرہ۔ ناصر کاظمی کی زندگی اور شاعری کی چند نمایاں اور اہم ترین خصوصیات ہیں اور 'سر کی چھایا' میں بھی انتہائی شدت کے ساتھ کارفرما نظر آتی ہیں۔

(۱۰)

'سر کی چھایا' محض ایک پڑھی جانے والی منظوم کہانی نہیں بلکہ باقاعدہ سٹیج پر پیش کیا جانیوالا ڈرامہ ہے۔ یہ حقیقی سٹیج اور اس کے تقاضوں کو مدِنظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔

بقول ولسن نائٹ، 'ڈرامے کو کاغذ کے اوراق سے جیتے جاگتے سٹیج پر منتقل کرنا کسی نازک فرنیچر یا بھاری مشینری کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا سا عمل ہے۔ اگر اسے جوں کا توں لے جایا جائے تو ٹوٹ پھوٹ لازمی ہے۔ اس کے مختلف حصوں یا پرزوں کو الگ الگ کر کے احتیاط سے لے جانا پڑے گا اور پھر انہیں جوڑ کر دوبارہ تشکیل کرنا ہوگا چنانچہ ہدایت کار ڈرامے کو نئے سرے سے تخلیق کرنے کا اہل ہونا چاہیئے۔ ایسا تبھی ممکن ہے جب وہ ڈرامے کی مابعد الطبیعاتی اساس سے واقف ہو۔ وہ اسے محض ایک اچھی کہانی نہ سمجھے جس میں کہیں کہیں ڈرامائی صورت ہائے احوال ہوں۔ اسے چاہیئے کہ سب سے پہلے انتہائی توجہ سے ڈرامے کی مدلل تعبیر اور تفسیر کرے۔ تفصیلات پر غور و فکر بے ثمر ثابت ہوگا جب تک ان میں رشتہ قائم کرنے والا وحدانی خیال بے نقاب نہ کیا جائے۔ محض سطح سے کام نہیں نکالا جا سکتا۔ باطنی معانی میں اترنا ضروری ہے۔ ہم کوئی ڈرامہ پیش نہیں کر سکتے جب تک اس کا مکمل احاطہ نہ کر لیں اور اسے ایک وحدت کے طور پر نہ دیکھنے لگیں۔ انفرادی لمحوں کی بجائے پورا ڈرامہ نظر میں ہونا چاہیئے۔ ایک صورتِ حال دوسری صورتوں کی وضاحت یا عکاسی کرتی ہوئی دکھائی دے۔ فوری اور لمحاتی تاثر کافی نہیں ہوتا۔

'سر کی چھایا' کی مابعد الطبیعاتی اساس کیا ہے؟ اس کے باطنی معانی کیا ہیں اور وہ وحدانی خیال کیا ہے جو اس کے اجزا میں ایک پائیدار رشتہ قائم کرتا ہے؟

عبدل تمام حساس انسانوں کا نمائندہ ہے۔ اس کا کرب ہم سب کا کرب ہے۔ اس کی کہانی ہر انسان کی کہانی ہے۔ انسان — جسے چننے اور مسترد کرنے پر اختیار ہے لیکن یہی اختیار اس کی سب سے بڑی مجبوری بھی ہے۔ "کچھ حاصل کرنے کا مطلب بہت کچھ کھو

دینا بھی ہے۔ ایک طرف دیکھنے کے معنی ہیں باقی ہر طرف سے منہ موڑ لینا۔ ایک جگہ پاؤں رکھنے کا مطلب سیکڑوں جگہ پاؤں نہ رکھنا ہے۔ پھر جو کچھ حاصل ہوتا ہے اسے بھی تو ثبات نہیں۔ زندگی ہر لحظہ دست بردار ہوتے رہنے کا نام ہے۔ اپنی آرزوؤں، صلاحیتوں اور قوتوں سے، اپنے خوابوں، ساتھیوں اور پیاروں سے۔" اور بالآخر کیفیت اس شعر کے مصداق ہو جاتی ہے

شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
جو قافلہ میرا ہمسفر تھا مثالِ گردِ سفر گیا وہ

حافظہ انتہائی قیمتی نعمتوں میں سے ہے لیکن یہ اتنا بڑا عذاب بھی بن سکتا ہے کہ انسان اس کے چھن جانے کی دعا مانگے۔ محبوب کی یاد دل دھڑکنے کا سبب بھی ہو سکتی ہے اور دم نکلنے کا باعث بھی۔ آگہی سکون بھی بخشتی ہے اور ایک دائمی آشوب بھی۔ دور بینی شکست کو فتح میں بھی بدل دیتی ہے مگر بعض اوقات جنگ سے پہلے ہی ہتھیار پھینکنے کا باعث بن جاتی ہے۔ دور اندیشی عمل کے لیے بھی محرک بنتی ہے اور بے عملی کو بھی جنم دیتی ہے۔ مستقبل کی فکر کبھی تو پیغام بیداری بن جاتی ہے اور کبھی ایسی مایوسی پیدا کرتی ہے کہ تمام جد و جہد لاحاصل اور بے ثمر نظر آتی ہے۔ خیالِ یار کڑی دھوپ کے سفر میں سر پہ چادر کا کام دیتا ہے تو شب کی تنہائیوں میں کانٹوں کا بستر بھی بن جاتا ہے۔

تو کیا قنوطیت، یاسیت اور بے عملی 'سر کی چھایا' کی اساس ہے؟ ہرگز نہیں؛ عبدل تمام مشکلات، مخالفتوں اور حادثوں کے باوجود زندگی کو ایک نعمت سمجھتا ہے۔ وہ اگرچہ شدید محبت کرنے کا اہل ہے اور اپنی محبوبہ کے ساتھ جل مرنے کو بھی تیار ہو جاتا ہے لیکن اس کے اندر کا حقیقت پسند انسان ہمیشہ غالب آجاتا ہے۔ اس کے خواب بہت حسین اور شیریں ہیں مگر وہ دنیا کو ان پر قربان نہیں کرتا ؎

کچھ آدمی کی بھی مجبوریاں ہیں دنیا میں
ارے وہ دردِ محبت سہی تو کیا مر جائیں

نندی کو حاصل کرنے کے لیے وہ جان کی بازی لگا دیتا ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ع

وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

عبدل کی کہانی سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ زندگی سے فرار کی کوشش دکھ اور پریشانی کا باعث بنتی ہے۔ ماضی میں پناہ لینا ممکن نہیں۔ عبدل، احمد اور فیاض بار بار یادوں کی دنیا میں جاتے ہیں لیکن جلد یا بدیر حقیقت کی دنیا (گاڑی) میں واپس آجاتے ہیں یا یوں کہا جائے کہ انہیں واپس آنا پڑتا ہے۔ آٹھویں منظر میں احمد نامساعد حالات کے باوجود شکست ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ مایوسی کی باتیں کرتے ہوئے ایک نئے عزم اور امید کے ساتھ کہتا ہے:

اسی گاؤں میں گھر بنائیں گے
اب تو یہی تھل بسائیں گے

پھر گیارہویں منظر میں جب اکبر اس سے کہتا ہے: ۔

تو اتنی جلدی ہی کیا ہے احمد؟
میرا تو دل کانپتا ہے جب بھی خیال آتا ہے دوستوں کا
یہ حصے وصے کی بات چھوڑو!
جو کام کرنا ہے کرتے جاؤ!

تو اس کا جواب ہے:

مَیں قانون کی رو سے کہتا ہوں
ورنہ مرا دل بھی دکھتا ہے
حسنی بھی اپنا بڑا یار تھا
اور عبدل تمہارا بڑا دوست تھا
بلکہ دونوں تمہارے ہی ساتھی ——

مگر خیر! چھوڑو یہ باتیں!
ذرا کنج گھر تو دکھا دو!

آخری دو سطریں انتہائی اہم ہیں بلکہ زیرِ بحث موضوع کے بارے میں فیصلہ کن۔ بیتے ہوئے حسین لمحے کسے عزیز نہیں ہوتے؟ مگر کنج گھر (حال اور مستقبل) زیادہ اہم ہے۔ زندگی ماضی اور مستقبل میں توازن قائم کرنے کا نام ہے۔ ماضی سے سبق سیکھ کر، قوت حاصل کر کے مستقبل کو سنوارنا ہی عینِ حیات ہے ؎

ہر نفس شوق بھی ہے منزل کا
ہر قدم یادِ رفتگاں بھی ہے

اور دیکھا جائے تو 'برگ نے' کا یہ شعر 'سر کی چھایا' کا عنوان بن سکتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ گاڑی کے سفر نے زندگی کے سفر کو مجسم اور متحرک شکل دے دی ہے۔ مسافر اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے بھی بیتاب ہیں اور یادوں میں بھی کھو کھو جاتے ہیں۔ لیکن جونہی ماضی غالب آنے لگتا ہے، گاڑی رک جاتی ہے اور وہ بھی تاریک اور سنسان جنگل میں۔ گاڑی ایک لحاظ سے تصور کی علامت بھی ہے جو ماضی میں زیادہ دور نکل جائے تو غیر فعال ہو کر رہ جاتا ہے۔

وجہِ تسکین بھی ہے خیال اس کا
حد سے بڑھ جائے تو گراں بھی ہے

ناصر سلطان کاظمی
اگست ۱۹۸۱ء

★ یہ سطریں راقم الحروف کے طویل نثری ڈرامے "بساط" کے ایک مکالمے سے اخذ کی گئی ہیں۔ جب یہ تعارف لکھا گیا تھا اس وقت چونکہ "بساط" شائع نہ ہوا تھا (اگرچہ یہ مکالمہ لکھا جا چکا تھا) لہٰذا اس بات کی نشاندہی نہ کی جا سکی۔

سُرکی چھایا

(ایک کتھا)

پہلا منظر

شام کا وقت ہے۔ ریل گاڑی ایک پہاڑی علاقے میں فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی ہے۔ درمیانے درجے کے چھوٹے سے ڈبے میں چند سافر بیٹھے ہیں تین آدمی ایک طرف بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔

زمانہ —— ہجرت کے بعد

وقت —— ڈھلتا سُورج

کردار

احمد —— عمر ۳۷ سال

فیاض —— عمر ۴۱ سال

مولوی صاحب — عمر ۵۰ سال

تصویر حسین، منجن بیچنے والا — عمر تقریباً ۴۰ سال

عبدل — عمر تقریباً ۳۰ سال

[سفر کر رہا ہے۔ راستے میں اس کا گاؤں پڑتا ہے۔ احمد اور فیاض عبدل کے گاؤں میں رہتے ہیں، لیکن وہ دونوں عبدل سے ناواقف ہیں]

احمد —— میاں یہ تو کہنے کی باتیں ہیں
کچھ بھی نہیں وہم ہے۔

فیاض —— بس جی آپ نے سو باتوں کی ایک بات کہی ہے۔
آئے دن کہیں جانا نکلنا ہی رہتا ہے

نیل کنٹھ کوئی ایسی چیز نہیں
یہ دائیں اُڑے یا بائیں
ہم نے تو کبھی دھیان دیا ہی نہیں ....

احمد ـــــ بھلا آج کل کے زمانے میں!
قبلہ! ذرا سوچیے تو سہی!!

مولوی صاحب ـ تم مری عُمر کو پہنچو گے تو پھر پوچھوں گا
تم نے دیکھا ہی ابھی کیا ہے؟

فیاض ـــــ آپ نے اِک دُنیا دیکھی ہے
گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے
ٹھیک ہے! لیکن آپ ہی سوچیں کیا یہ وہم نہیں ہے؟

احمد ـــــ دیکھیے نا! اُدھر کس قدر دُھوپ ہے!
آپ اِدھر میرے نزدیک آجائیں
کافی جگہ ہے!

فیاض ـــــ مولوی صاحب آپ یہاں آجائیں!
اس کھڑکی کے پاس ذرا آرام سے بیٹھیں!

مولوی صاحب ـــ تم مرا غم نہ کرو
مَیں جہاں بھی ہُوں وہیں اچھا ہُوں!

فیاض ـــــ حضرت آپ تو سچ مچ رُوٹھ گئے ہیں
بحث میں ایسا ہو جاتا ہے

مولوی صاحب ـــ ابھی لونڈے ہو میاں! بات تو کرنا سیکھو!
مَیں نے تجھ سے کئی لونڈے دیکھے!
تیرے ابّا کے بھی ابّا کا زمانہ دیکھا
مَیں نے تو ایک صدی دیکھی ہے!

فیاض —— دیکھیے حضرت! ابّا دبا رہنے دیں بس
نہیں تو .....

مولوی صاحب —— بس مرے مُنہ نہ لگو
ہُنہہ بڑے آئے کہیں کے ....

فیاض —— دیکھیے صاحب! آپ زبان سنبھال کے بولیں
چٹی داڑھی کی عزّت کرتا ہوں ورنہ!
چُپکے ہو کے بیٹھے رہیے!

مولوی صاحب —— مَیں کہا چُپ رہو بس .....

احمد —— چار دِن کتنی جھڑیاں لگیں پھر بھی گرمی کی شدّت وہی ہے!

فیاض —— توبہ میری!
دن ہے یا شیطان کی آنت

احمد —— بھلا کیا بجا ہے؟

فیاض —— پُورے پانچ بجے ہیں

احمد —— کہاں جائیں گے آپ؟

فیاض —— سُورج پُور! بس اگلے اسٹیشن سے آگے

[عبدل ذرا دُور کونے میں کھڑکی کی طرف بیٹھا ہے۔ وہ سُورج پُور کا نام سُنتے ہی چونک پڑتا ہے اور پھر کسی خیال میں کھو جاتا ہے]

احمد —— ارے پھر تو اک ساتھ اُتریں گے
مَیں تو نئی شہر جاؤں گا

فیاض —— سُورج پور اب تھوڑی دُور ہی ہوگا!

احمد —— نہیں! گھر پہنچتے پہنچتے ہمیں رات پڑ جائے گی

فیاض —— آج تو ساتویں رات ہے خاصا چاندنا ہوگا
ٹھنڈے ٹھنڈے گھر پہنچیں گے

احمد ـــــ آپ کو مَیں نے پہلے بھی دیکھا ہے ؟
فیاض ـــــ دیکھا ہوگا ! نویں شہر میں دیکھا ہوگا !
میں بھی آپ کی صورت تو پہچان رہا ہُوں
کہاں ملے یہ دھیان نہیں
احمد ـــــ نویں شہر میں کچھ مہینے ہُوئے مَیں نے بنگلہ لیا ہے
وہاں میرے بھائی کا لڑکا ہے
وہ ڈاکٹر ہے !
ارے ہیں ! یہ گاڑی کی رفتار کو کیا ہُوا ؟
[ریل گاڑی ایک جھٹکے سے اسٹیشن پر رُک جاتی ہے۔ کچھ مُسافر رنگ برنگے
کپڑے پہنے ایک ڈبے کی طرف تیزی سے دَوڑتے ہیں۔ سُورج ڈُوب رہا ہے۔
پھیری والوں اور مسافروں کی ملی جُلی آوازیں اور انجن کی شائیں شائیں فضا کو خاموش کر دیتی
پہلی آواز ـــــ پان بیڑی سگرٹ
فیاض ـــــ بیڑی والے ! او میاں بیڑی والے !
کون سا اسٹیشن ہے بھائی ؟
پہلی آواز ـــــ بابو جی ! یہ سیتد پُور ہے !
دوسری آواز ـــــ سو ـ ڈا ـــ بر ـ ف ـــ لے مَن سو ـــ ڈا
فیاض ـــــ سگرٹ والے اِدھر تو آنا ؟
جلدی ! بھاگ کے ! گولڈ فلیک کی ڈبیا دینا
چار پان بھی ! باقی پیسے واپس کر دو
یہ لو ایک روپیہ !
(احمد کی طرف دیکھ کر) چائے پئیں گے ؟
احمد ـــــ نہیں اب تو گھر ہی پہنچ کر پئیں گے !

..... میاں گاڑی چلنے لگی ہے
اب اندر چلے آؤ !!

آوازیں —— بیرا گڈی چلنے لاگی دَوڑ کے آجا
تیرا ٹکس کہاں ہے ؟
چھجو چاچا میرا بکسا کھڑکی ماں تے پھینک دے جلدی
اچھا اللہ بیلی بیرا !
ہو ! چِٹھی اَستابی پائیے !

[گاڑی چھوٹتی ہے ۔ فیاض احمد کے پاس آکر بیٹھ جاتا ہے ۔ ایک منجن بیچنے والا دو چھوٹی چھوٹی شیشیاں ہاتھ میں لے کر آواز لگاتا ہے ۔ عبدل کھڑکی کی طرف مُنہ کیے خاموش بیٹھا ہے]

فیاض —— یہ تصویر حسین یہاں بھی آدھمکا ہے
اِس کی بات پہ دھیان نہ دینا
دھوکے باز کہیں کا .....

تصویر حسین —— اے دوستو لایا ہوں بڑی دُور سے منجن
دندانِ مُبارک پہ لگا لو مرا منجن
"جس کے مُنہ سے آوے باس
اس کی دارُو میرے پاس"
یہاں خریدو آٹھ آنے میں
ریل گاڑی سے باہر لوں گا ایک روپیہ !
ہے کوئی بھائی ! آٹھ آنے میں
مولوی صاحب !! آٹھ آنے میں
منجن میرا سب سے نرالا
اس کو لے گا دانتوں والا

مولوی صاحب — "بتوں کی چاہ گئی ہو بُرا ضعیفی کا
اِدھر تو پک گئے بال اور اُدھر سدھارے دانت"
اپنا دِن ڈوب چُکا ہے بابا
جاؤ اب آگے سے رستہ چھوڑ دو!
اس طرف جاؤ ہوا آنے دو!

تصویر حسین — جاتا ہُوں چلا جاتا ہُوں بگڑو نہیں بابا
اے دوستو لایا ہوں بڑی دُور سے منجن
دندانِ مبارک پہ لگا لو مرا منجن

فیاض — (آہستہ سے) میں تو جانوں یہ پھڑ باز ہے!
مُفت میں آٹھ آنے کیوں کھوئیں؟

احمد — میاں آٹھ آنے کے سگرٹ پیئں گے!

تصویر حسین — چھک بابا پیسہ لے جا
چھک بابا پیسہ لے جا
"وزن برابر سب کو تول
دارو ہووے یوں انمول
زیرہ مہر چیں ستوا سونٹھ
کہتا اُجلا لے کر گھونٹھ
جوں جوں لگاوے پاوے سُکھ
تجھ دانتوں کا جاوے دُکھ"
آٹھ آنے میں! ہے کوئی لینے والا بھائی!

ایک آواز — یہ لو اٹھنی! ایک شیشی دے دینا بھائی!

دوسری آواز — ایک شیشی اِدھر کو بھی لانا!

تصویر حسین — منجن میرا سب سے نرالا
اس کو لے کا دانتوں ولا
آٹھ آنے میں! دُنیا لُٹ گئی
آٹھ آنے میں
آپ .... جناب .... آپ ۔ اور آپ .....

فیاض — لیجئے سگرٹ پیجئے!

احمد — شکریہ میں ابھی پی چکا ہوں
(مختصر سا وقفہ)
نویں شہر میں آپ کا گھر کہاں ہے؟

فیاض — وہاں تو اپنا کاروبار ہے
پچھلے دِنوں ہی بھائی نے ہوٹل کھولا ہے!
اب اچھا خاصا چلنے لگا ہے!
سُورج پُور میں اپنا گھر ہے۔
اُونچی مسجد سے کچھ آگے وہ جو عظمت منزل ہے نا!
وہی ہمارا گھر ہے۔

عبدل — (سوچتا ہے) یہ فیاض ہے! عظمت منزل والوں کا وہ منجھلا لڑکا!
یہ میرے بچپن کا ساتھی!

یہ اب کتنا بدل گیا ہے؟

احمد — کچھ مہینے ہُوئے مَیں نے بستی سے دو میل پر پانچ ایکڑ لیے تھے
وہ عبدل ..... وہی کنج گھر پھر چلایا ہے ہم نے!

وہی شیشہ گر مل گیا ہے
بس اب کام چلنے لگا ہے

فیاض ـــــ اچھا اچھا اب میں سمجھا
آپ اکبر کے حصہ دار ہیں!
بڑا ہی نیک انسان ہے اکبر

احمد ـــــ تو کیا آپ اکبر سے واقف ہیں؟
وہ میرا ساتھی ہے!

فیاض ـــــ کام تو اچھا خاصا ہے پر کاریگر ملنے مشکل ہیں

احمد ـــــ اجی اپنے قصبے میں بے کار لوگوں کا توڑا ہے!
ان کو سکھا لیں گے، بس دو مہینے کا قصہ ہے
چھ سال کے بعد اس کنج گھر کو چلایا ہے
منت سے انجینئر کو منایا ہے
کیا آپ عبدل سے واقف ہیں؟

فیاض ـــــ مدت گزری! برسوں گزرے!
مَیں تو اس کے بعد آیا تھا۔
بارہ برس کے بعد آیا تھا۔
پہلے سنگاپور رہتا تھا۔
ابا جی نے خط لکھا تھا ان کے بُلانے پر آیا ہُوں
مَیں بھی اب تو بڑے سے کام کی سوچ رہا ہوں

عبدل ـــــ (سوچتا ہے)
یہ احمد ہے! اکبر میرے دوست کا ساتھی!
کبھی کبھی یہ اکبر سے مِلنے آتا تھا
اکبر میرا دوست مجھے کیا بھول گیا ہے؟

اکبر، حسنی دونوں ساتھی سوچتے ہوں گے!
مَیں اور نندی دونوں جل کر ....

احمد و —— (فیاض سے)
آپ بھی اب نویں شہر میں گھر بنالیں
بڑی خوب صورت جگہ ہے

فیاض —— جی ہاں! اپنا ارادہ تو پکّا ہے
پھول گلی میں پچھلے برس دو قطعہ زمین لیے تھے
اب تو نیویں کھدنے لگی ہیں
اللہ کو منظور ہُوا تو گھر بھی جلدی بن جائے گا!

احمد —— اب تو چاروں طرف سے وہاں لوگ بسنے لگے ہیں
نئی طرز کی کوٹھیاں بن رہی ہیں
کھُلی صاف شیشہ سی سڑکیں ہیں
سڑکوں کے دونوں طرف سنگتروں کے درختوں کا اک سلسلہ ہے

فیاض —— سُورج پُور اب پھر نہ بسے گا
آج سے سات برس پہلے جب اس جنگل کو آگ لگی تھی
وہ دِن اپنے گاؤں کی بربادی کا دِن تھا

احمد —— جہاں کمیروں کے مکاں تھے وہاں ڈاک خانہ بنا ہے

فیاض —— ہاں جی! اپنے دیکھتے دیکھتے دُنیا کتنی بدل گئی ہے؟
جہاں وہ اینٹوں کا بھٹہ تھا
جلے ہُوئے جنگل کے ٹھُنٹھ پڑے تھے
وہاں یہ شہر بسا ہے!

احمد —— جہاں وہ پُرانا کنواں تھا وہاں بجلی گھر بن گیا ہے!

عبدل ـــ (نندی سے اپنی آخری مُلاقات اس کی آنکھوں میں پھر جاتی ہے)

.. ..

وہ دِن یاد ہیں!
اسی کنویں پر سانجھ سویرے کھیلنے آتے
وہ میلہ! ..... وہ ناچ کتھا!
پھر چیت کا میلہ آیا .... مَن بھایا. ہو آیا۔

.. ..

سُورج پُور اب پھر نہ بسے گا!
سُورج پُور .. .. وہ آگ کی نگری!
وہ اندھیاری رات ـــ وہ جنگل!

.. ..

کہاں ہو نندی؟ یاد ہیں وہ دن؟
جب ہم چھوٹے چھوٹے سے تھے!

.. ..

مَیں اور حسنی کھیل رہے تھے

دوسرا منظر

سُورج پُور کے زمیندار حشمت کا لڑکا عبدل اور اس کا منہ بولا بھائی حسنی دونوں اپنے مکان کے صحن میں کھیل رہے ہیں ۔

کردار

پپّو ـــ (عبدل) عمر ۶ سال
گُنی ـــ (حسنی) عمر ۸ سال
کٹو ـــ گلہری
ـــ بندر
بُلھا ـــ سُورج پُور کے نمبردار کا لڑکا ۔ عمر ۹ سال
نندی ـــ بُلھے کی بہن عمر ۶ سال

(پپّو گھر کے صحن میں سے گاتا ہُوا باہر ڈیرے میں آجاتا ہے)

پپّو ـــ تُو چل قمری میں آتا ہُوں
میں ہیرے پنّے لاتا ہُوں
میں ٹھُم ٹھُم کرتا آتا ہُوں
تُو چل قمری میں آتا ہُوں
آتا ہُوں!
آتا ہُوں!

(پپّو حسنی کو آواز دیتا ہے)

گٹّی بھیّا! دَوڑ کے آؤ!

یہ دیکھو یہ کیا ہے بھیّا!

گُٹّی —— ابے کیا ہے؟ کیوں کان کھائے ہیں؟

پ —— (بند مُٹھی کو دُور سے دکھا کر آواز دیتا ہے)

گٹّی بھیّا! ایک چیز ہے!

چھوٹی سی ہے!

گ —— (دوڑا ہُوا پپّو کے پاس آکر پُوچھتا ہے)

بتا دے نا بھیّا!

میرے اچھے بھیّا نہیں ہو!

پ —— نا بھیّا جی تم ہی بوجھو!

گ —— .. .. ادھنی ہے!

پ —— ایسی ویسی چیز نہیں ہے!

گ —— ابے کھول مُٹھی!!

پ —— پہلے ہار تو مانو

گ —— بھلا تجھ سے مَیں ہار مانوں!

ذرا اپنی مُٹھی کو سُورج کے [illegible]!

بتاتا ہُوں بس مَیں ابھی بُوجھتا ہُوں!

یہ شیشے کی کرچی ہے!

پ —— اتا پتا بھی اس کا سُن لو

کھانے میں نہ پینے میں

چکھنے میں نہ سُونگھنے میں

چھوٹی سی ہے!

بالکل ننھی مُنی سی ہے
گوری چِٹی بگلے جیسی!

گ — ابے او! یہ اِتّی ہے!
کم بخت تُو نے چرائی ہے

پ — ہم نی بتاتے!
ہم نی دکھاتے!
تم ہی بُوجھو!

گ — ابے تُو دکھاتا ہے یا مار کھائے گا؟

پ — پہلے میرا ہاتھ تو چھوڑ دو!
(پپّو بھاگنے لگتا ہے)

گ — (دَوڑ کر اِسے پکڑ لیتا ہے)
ابے بِل کُھٹیتے بتا دے نہیں تو!

پ — پہلے اپنی آنکھیں میچو!
کن مِن کانی کون کِنا
کن مِن کانی کون کِنا
ہت تیرے کی دیکھ رہا ہے!
آجا! آجا! آجا
اچھا جی! اب آنکھیں کھولو
(پپّو مُٹھی کھول دیتا ہے)

گ — ارے بس یہی چیز تھی نا!
یہ کنکی کہاں سے مِلی ہے؟
ارے باپ رے باپ!
پپّو! وہ بندر ادھر آرہا ہے!

وہ بندر تجھے کاٹ کھائے گا!

پ ـــــ کیوں کاٹے گا؟
یہ بندوق نہیں دیکھی کیا؟
تیری غلیل کہاں ہے؟

گ ـــــ ارے تُو نہیں باز آتا!

پ ـــــ وہ دیکھو وہ کٹو آئی
آؤ اس کو پکڑیں بھیّا!

(کٹو کیکر کے تنے پر سے بار بار اُترتی ہے۔ سڑک کے درمیان تک آتی ہے اور پھر بندروں کے ڈر سے یا کوئی آہٹ سُن کر لوٹ جاتی ہے)

چری ٹیٹو، چری ٹیٹو۔
چری ٹیٹو، چری ٹیٹو
اُو اُو! خی خُو، اُو اُو خی خُو
اُو اُو خی خُو اُو اُو خی خُو

گ ـــــ ارے او لٹونی کہاں جا رہا ہے!

پ ـــــ وہ کٹو نہیں آتی بھیّا!
وہ ہم سے ڈرتی ہے!

(گٹی سڑک کی طرف دیکھ کر زور زور سے آواز دیتا ہے۔ اس کا دوست بُلّھا اپنی بہن نندی کے ساتھ آ رہا ہے)

گ ـــــ ارے ہم یہاں ہیں!
یہاں آؤ! نندی اِدھر! ہم یہاں ہیں!

پ ـــــ بُلّھا بھی تو ساتھ ہے بھیّا!
مَیں اس سے نہیں بولوں گا جی!

گ ـــــ ابے چُپ رہو وہ مرا دوست ہے۔

بُلّھا —— ہم گھر چلے ہیں گٹی!
(بہن کو غصّے میں آواز دیتا ہے)
نندی! کہاں چلی ہو؟
ٹھہرو اُدھر نہ جاؤ!

پپ —— دیکھو نندی! یہ کیا چیز ہے؟
کِنکی لو گی؟
چِٹی، کالی، نیلی، پیلی
رنگ رنگ کی کِنکیاں ہیں یہ؟

بُلّھا —— بیچارہ چُپکا ہو کر
آیا بڑا کہیں کا!

نندی —— نا بھیا جی پپّو جی کو کچھ نہ کہنا!

بُلّھا —— بکواس مت کرو جی!

نندی —— پپّو جی ہم کل آئیں گے!
کل چھُٹی کا دِن ہے پپّو
کل آؤں گی!

پپّو —— ٹھہرو! نندی وہ دیکھو وہ کٹو آئی!

(بُلّھا نندی کا ہاتھ پکڑ کر جلدی سے گزر جاتا ہے اور کٹو پھر واپس جا کر کیکر کے تنے پر چڑھ جاتی ہے۔ بندر شور مچاتے ہیں)

○

تیسرا منظر

(سُورج پُور اور پُرانے جنگل کے درمیان ایک بہت بڑا میدان ہے۔ اس میدان میں چیت کا میلہ لگا ہے۔ ٹھٹھ کے ٹھٹھ آس پاس کی بستیوں سے میلہ دیکھنے آئے ہیں۔ طرح طرح کی دُکانیں سجی ہیں۔ قسم قسم کے گھوڑے اور مویشی میلے میں نمائش کے لیے لائے گئے ہیں۔ ناچ رنگ سے ساری بستی گونج رہی ہے۔)

زمانہ — ہجرت سے پہلے

وقت ۔ دن چڑھے

کردار

کچھ مَرد اور عورتیں

بُندو

نندی

حسنی

عبدل

اُوشا

گھوڑا اور بیل۔

(عورتوں اور مَردوں کی ایک ٹولی ناچ گتھا میں ڈُوبی ہوئی ہے۔ عبدل، نندی اور حسنی بھی اس ہجوم میں موجود ہیں)

کورس — پھر چیت کا میلہ آیا

سَن بھایا

ہو آیا
پھر چیت کا میلہ آیا

بندو — چھب سُندر گورے گال
جوبن پر چمکیں لال
کھرا ہے مال
زمانہ گوری کا

کورس — پھر چیت کا میلہ آیا
من بھایا
ہو آیا

عورت — ہٹ دُور پرے کل مُوئے
تو میرا جوبن چھوئے
تری اکھیوں ماں ڈالوں سُوئے
کل مُوئے

کورس — پھر چیت کا میلہ آیا
من بھایا
ہو آیا

بندو — "ہم تو زرے عشق ماں مرگئے تینے کھیل کناری دیکھے"
کورس — "اس بانکے رے ترچھے گھونگٹ ماں توں سارے جگ تے نیاری دیکھے"
ایک آواز — متھے پر جھمر لشکاں مارے ۔ مانگ ماں چمکیں توماں
دوسری آواز — سارا گاؤں دہائیاں دیوے سہرماں پڑ گئیں دھوماں
بندو — جوں جوں گوری غصے ہووے مُنّے ہور بی پیاری دیکھے
کورس — اس بانکے رے ترچھے گھونگھٹ ماں توں سارے جگ سے نیاری دیکھے

(تھوڑی دُور سے ڈھول اور تماشائیوں کی آوازیں آرہی ہیں) ...

دھنا دھن دھن
دھنا دھن دھن

نندی ـــــ (عبدل سے)
چلو بیل گھوڑے کی دیکھیں لڑائی
(عبدل ذرا پانی پینے چلا جاتا ہے)

حسنی ـــــ کبھی ہم سے بھی کرو پیار
اب یوں نہ کرو انکار
کرو اقرار
پھر چیت کا میلہ آیا
من بھایا
ہو آیا

نندی ـــــ چلے جاؤ حسنی!
کئی بار تم سے کہا ہے کہ مجھ سے نہ بولو!

عبدل ـــــ کیا ہے نندی! کیا ہے؟
حسنی بھیا اُدھر چلو گے!

ڈھول کی آواز۔ دھانا دِھن دِھن
دِھنک دِھنک دِھن دِھن دھا
دِھنک دِھنک دِھن دِھن دھا

(زندہ دل تماشائیوں کا ایک ہجوم گھوڑے اور بیل کی لڑائی دیکھ رہا ہے۔ نندی اور عبدل بھی اس ہجوم میں مل جاتے ہیں۔ حسنی ایک طرف ہجوم میں کھو جاتا ہے اور اپنا دوتارہ زمین پر دے مارتا ہے۔ ایک کالے گھوڑے کی پیٹھ پر سبز مخمل کا تار و ڈالا ہوا ہے۔ پاؤں میں جھانجریں ہیں۔ اُدھر ایک نیلا بیل ہے جو گاؤں کا سب سے جوان اور خوفناک نارا ہے۔ اس کے سینگوں پر لوہے کے خود چڑھے ہوئے ہیں۔ کمر پر سُرخ رنگ کی قیمتی چادر ہے۔

گھوڑے پر ایک نوجوان سوار ہے۔ اس کے ہاتھ میں نیزہ ہے۔ گھوڑے اور بیل کے مالک ایک دوسرے کو للکارتے ہیں۔ لڑائی شروع ہوتی ہے)

ڈھول کی آواز — دھانا دِھن دِھن
دھانا دِھن دِھن
دھانا دِھن دِھن
دِھنک دِھنک دِھنک دھا
دِھنک دِھنک دِھنک دھا

(گھوڑا اور بیل مقابلے میں آتے ہیں)

گھوڑا —— (گھوڑا کہے بیل سے)
مَیں ہُوں ایسا گھوڑا
مست ہو کے جب لہراں آؤں
جھنجھل اُٹھا کے پیر اٹھاؤں
کئی کوس منٹوں ماں جاؤں
دے جواب او بیل تو میری بات کا!

بیل —— سانچے بچن بیل کہے سُن گھوڑے میری بات!
اونچی بولی بول کے کھول نہ اپنی ذات
مَیں ہُوں اپنی ماں کا نارا مالک میرا کسان
صحرا کا لقمان
کھڑی دوپہری ہل ماں جوتے پانی دے نہ گھاس
کھنڈی آر سے چھوڑ کے کرے بدن کا ناس
باڑھی ہو کہ ساونی سب کے کشت اٹھاؤں
پھر بھی اپنے کام سے! کبھی نہ آنکھ چراؤں
دے جواب تو گھوڑے میری بات کا

گھوڑا —— او ہریا کے نارے اپنی ذات پچھان !
مری ٹاپ سے تھر تھر کانپیں بڑے بڑے بلوان
کیا پنکھرو کیا حیوان

ماں پر پُوت پتا پر گھوڑا
بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا
مَیں ہوں بلوچی گھوڑا !
میرے سُموں کی گھنی گرج سے پھٹ جاوے دھرتی کی کھال !

بیل —— دانت چھُپا کے بول رے ارجل !
مَیں ہُوں نادیا بیل !!
میرے آگے سے ہٹ جا او بے پیروں کے پیر
ایسی ٹکر پلٹ کے ماروں جان رہے نہ سر پہ
سِنگ ایسی گھما کے ماروں چھلنی ہو سورج کا تھال
او خچر کے لاڈے تُو کیا جانے میری چال!
چندر بنسی سُورج بنسی کا ہے مجھ میں خُون

گھوڑا —— ہٹ جا او ملعون !

بیل —— میری ماں کُل دھرتی کی ماں مَیں ناروں کا نارا
مَیں دھرتی کا پیارا

گھوڑا —— او بچھیا کے نارے اُونچا بول نہ بول

بیل —— او سوری کے جو !

گھوڑا —— ہوترا ہوجا بیل کا مُنہ !
مَیں ہُوں بلوچی گھوڑا

بیل —— مَیں ہُوں نادیا بیل !

(لڑائی شروع ہوتی ہے)

دَھانا دِھن دِھن
دَھانا دِھن دِھن
دِھنک دِھنک دِھن دِھن دھا
دِھنک دِھنک دِھن دِھن دھا
دھا ترکٹ دھا
دھا ترکٹ دھا
ترکٹ دھا
ترکٹ دھا
دھا ترکٹ دھا

عبدل ـــــ (نندی کے کان میں چپکے سے کہتا ہے)
ناچ کتھا دیکھو گی نندی!
سب اس شور میں کھوئے ہُوئے ہیں
مَیں چلتا ہُوں تم مرے پیچھے چلتی آؤ!
(ڈھول کی آواز تیز ہو جاتی ہے)

نندی ـــــ میرے بھیّا یہاں آگئے تو.....

عبدل ـــــ نہیں وہ ادھر کیا کرے گا!

(عبدل اور نندی ناچ کتھا میں آجاتے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے حسنی بھی آتا ہے)

کورس ـــــ پھر چیت کا میلہ آیا
من بھایا
ہو آیا

حسنی ـــــ (نندی کو کہتا ہے)
خلقت ناچے پی کے بھنگ
تم بھی ناچو میرے سنگ

نندی — نہیں مَیں نہ ناچوں گی!

عبدل — ناچو نندی! یہ میلہ ہر روز نہیں ہوتا ہے نندی!

نندی — نہیں مَیں نہ ناچوں گی عبدل!

نہیں مَیں نہ ناچوں گی!

بُندو — (حسنی کو کہتا ہے)

ناچ رے بھین ناچ

اوشا کے سنگ ناچ

خُوب رہے گا اوشا اور حسنی کا جوڑا

اس میلن میں ناری کا کیا توڑا

(اوشا اور بندو حسنی کو مُسکرا کر دیکھتے ہیں)

حسنی — رادھے بن کیا ناچے بچیا منڈل بھیٹو اداس

سب نَرناری میلن دیکھیں مَیں دیکھو آکاس

اُوشا — مَیں تیری رادھا ہُوں موہن مَیں ناچوں تُو گا!

مُدھر بانسری چھیڑ کے مَن کی جوت جگا

(بندو ساز چھیڑتا ہے اور حُسنی ناچنے لگتا ہے۔ ہرنوں کی ایک ڈار

چوکڑیاں بھرتی ہُوئی قریب سے گُزر جاتی ہے)

حسنی — بینا باجے تنا نوم تنا نوم

جھانجھن بولے چھن

نادھن دِھن نا ڈھولک بولے مُدھر مُدھر بجے بین

بہت بڑی سرکار ہے تیری سید قطب الدینؒ

بینا باجے تنا نوم تنا نوم

جھانجھن بولے چھن

آئیو ری بجنی چتین میلن

سمے دکھاوے میٹھے سپنن
توڑ تاڑ کے چھوٹے دَرپن
دُھومن شاہ کا ناؤں رٹے من
ملت پھیریں 'تنگرا' ایمن
آئیو ری سجنی چیتن میلن
بینا باجے تنا نوم تنا نوم
جھانجھن بولے چھن

کورس — پھر چیت کا میلہ آیا
مَن بھایا
ہو آیا
پھر چیت کا میلہ آیا

بندو — دیکھو جی جو را جوری

حسنی — اِک چودہ برس کی چھوری
ملے ہم سے چوری چوری
ہو گوری

کورس — پھر چیت کا میلہ آیا
مَن بھایا
ہو آیا
پھر چیت کا میلہ آیا

ایک نوجوان — مرا نام منوہر لال
مری چاندی کی ٹکسال
کر دوں گا مالا مال
گوڑ و گھنشال

کورس — پھر چیت کا میلہ آیا
من بھایا
ہو آیا
پھر چیت کا میلہ آیا

اُوشا — بجے ڈھولک اور مردنگ
دوتارا اور مُنہ چنگ
تم گاؤ ہمارے سنگ
بہادر جنگ

کورس — پھر چیت کا میلہ آیا
مَن بھایا
ہو آیا
پھر چیت کا میلہ آیا

○

چوتھا منظر

(عبدل گاؤں کی لڑکیوں کو بڑھ کے ایک گھنے درخت کے پیچھے چھپ کر دیکھ رہا ہے
اس کے خاکی گھوڑے کی لگام اُس کے ہاتھ میں ہے)

مقام : سُورج پُور کے باہر میدان میں

کردار : نندی ۔ یاسمینہ ۔ زرینہ ۔ عبدل ۔ اکبر

نندی — کنوئیں میں نہ جھانکو!
یہاں سانپ رہتے ہیں

یاسمینہ — تیرا تو سَر پھرا ہے!

نندی — نہیں یاسمینہ یہ سب سے پُرانا کنواں ہے
یہاں اب کے ساون میں بھیّا نے دو سانپ مارے تھے
کم بخت پھنیئر تھے!

یاسمینہ — سانپ اور اس کنوئیں پر!

نندی — (جھنجھلا کر)
وہ کھیتوں میں کیا ہے؟
وہ گھوڑے پہ کون آرہا ہے؟

یاسمینہ — ہوگا کوئی تمہیں کیا؟

نندی — چلو آؤ دیکھیں تو وہ کون ہے؟

یاسمینہ — حسنی ہے مَیں تو جانوں!

نندی — اری چُپ رہو! اس میں ہمّت ہے اتنی!

زرینہ ـــــ (گنگنانے لگتی ہے)
بہتا ساگر چھوڑ کے کاہے لیو بن باس
برھن بدری اُڑے اکیلی دُور بھیو آکاس
ساجن بن جی نہ لگے برھن گا دے جوگ
نگری نگری پھرے اکیلی پتھر ماریں لوگ

یاسمینہ ـــــ اچھا جی اب مَیں سمجھی!
تو بھی جلی ہُوئی ہے!

نندی ـــــ بڑی پارسا ہے نا تُو!
جانتی ہُوں!
بتا کون تھا وہ جو میلے میں سُکھ پال لایا تھا؟
اب بولتی کیوں نہیں؟
کیسی چُپکی کھڑی ہے؟

(یاسمینہ، نندی اور زرینہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مُسکراتی ہیں اور گانے لگتی ہیں)

یاسمینہ ـــــ ماں ری ماں میں چودہ برس کی
(سب مِل کر) سولہ برس کا تھا ـــــ چھورا رانگڑ کا
سولہ برس کا تھا ـــــ چھورا رانگڑ کا
مجھے بلاوے تھا ـــــ چھورا رانگڑ کا

وقفہ

(عبدل گھوڑے پر سوار ہو کر سامنے آتا ہے۔ زرینہ اور یاسمینہ ڈر کر ایک طرف ہو جاتی ہیں اور نندی اکیلی رہ جاتی ہے)

عبدل ـــــ آؤ مَیں تم کو گھر چھوڑ آؤں
دیکھو! سُورج کتنا نیچے اُتر گیا ہے؟

نندی — (ذرا گھبرا کر)
نہیں جی! چلے جاؤ!

عبدل — ٹھہرو نندی!

نندی — امی کہتی تھیں غیر آدمی سے نہیں بات کرتے!

عبدل — وہ دِن یاد ہیں!
اسی کنوئیں پر سانجھ سویرے کھیلنے آتے!
وہ اِملی کا درخت ابھی تک اسی طرح خاموش کھڑا ہے!
آؤ گٹارے توڑیں!!
میں اِملی پہ چڑھ جاتا ہوں
تم پلّا پھیلاؤ!
وہ دیکھو! وہ ریت پہ بڑھیاں دوڑ رہی ہیں!
آؤ اُن کے پیچھے بھاگیں!
اُس نے پھر کشتی کے لنگر کھول دیے ہیں۔
کشتی چلنے لگی ہے!
پانی کی آواز سُنی ہے تم نے؟
(عبدل سامنے ایک کیکر کے درخت پہ گروسل کو کنکر مار کر اُڑا دیتا ہے)

نندی — (انگلی میں انگوٹھی کو پھرانے لگتی ہے)
شام کی خاموشی میں درختوں پہ کنکر نہیں مارتے
شام کو پیڑ آرام کرتے ہیں عبدل!
یہ رونے کی آواز کس کی ہے؟

عبدل — چرواہی بھیڑوں کو ہانک رہی ہے!

نندی — (گھبرا کر) نہیں یہ تو اُلو کی آواز ہے
جھاڑیوں میں کہیں کوئی چھُپا چھُپا ہے!

(زمین کی طرف دیکھ کر چونک پڑتی ہے)
ارے مَیں تو ڈر ہی گئی تھی!
یہ گھوڑے کا سُم ہے!
یہ اتنا بڑا قافلہ کس طرف جا رہا ہے!

عبدل ـــــ بے چارے اوڈ ہیں، خانہ بدوش ہیں
نگری نگری آوارہ پھرتے رہتے ہیں
مینہ بُندی ہو، آندھی ہو، چمکیلا دن ہو کالی رات ہو
رستے ہی میں پڑے رہتے ہیں
آدمی دن بھر مزدوری کرتے رہتے ہیں
عورتیں اپنے بچوں کو گودی میں لے کر
گھاس پھُوس اور ڈھیکر چنتی رہتی ہیں
اُونٹوں اور بھیڑوں کے دُودھ کو شہر میں جا کر بیچتی ہیں

نندی ـــــ مَیں کہتی ہُوں کوئی یہاں آ گیا تو!!

عبدل ـــــ (خانہ بدوشوں کے قافلے کی طرف دیکھتے ہُوئے)
یہ دھرتی اب سارے بندھن توڑ چکی ہے
اب یہ قبیلہ جاگ رہا ہے
بھیڑوں کو للکار رہا ہے
یا یہ بھیڑیں دُودھ نہ دیں گی
یا پھر ان کے تھن پر تھیلی چڑھ نہ سکے گی
وہ دیکھو! وہ رنگ برنگے ذرّے
بھُورے بھُورے نیلے نیلے پتھر
ریت کے تارے آگ کی ہولی کھیل رہے ہیں
پیلی کرنیں کیکر کی سیڑھی سے اُتر رہی ہیں

کالے ناگ سنہری جیب نکالے
گل گنجوں میں ناچ رہے ہیں

نندی —— ہوا کتنی خاموش ہے!
فاختہ ریت کے نرم بستر پر چپ چاپ بیٹھی ہے
ندی ہے ندی کا پانی ہے، پانی کی آواز ہے
فاختہ بہتے پانی کے شیشے میں اپنے ہی رُوپ کو تکتی ہے
لہریں اُچھلتی ہیں اور بیٹھ جاتی ہیں

عبدل —— اس کے ننھے پنجے دیکھو
ریشم کے لچھوں کی طرح باریک ملائم
اُس کے پَر اور اُس کی چونچ کو غور سے دیکھو
جب یہ اپنی چونچ کو ریت پہ رگھستی ہے
تو سارا جنگل گاتا ہے.....
تم کیا سوچ رہی ہو؟

نندی —— نہیں کچھ نہیں باؤلی ہوگئی ہُوں!

عبدل —— سوچ رہا ہوں ہم یوں کب تک
ہم یُوں کب تک... تم ہی سوچو!...ہم یوں کب تک!

نندی —— چلو اب یہاں سے چلیں!

عبدل —— فاختہ اُڑ کر ڈال پہ جا بیٹھی ہے
وہ دیکھو پھر نیچے اُتر گئی ہے!
اس کی چونچ میں کیا ہے؟

نندی —— وہ سرسوں کی پھلی ہے!

عبدل —— نیل کنٹھ کا پَر ہے شاید!

نندی — یہ اُڑتی نہیں — آؤ اس کو اُڑائیں!

عبدل — وہ دِن یاد ہیں!

مکتب سے جب چھٹی ملتی

ہم سب لڑکے چھوٹے چھوٹے کنکر چنتے

فاختہ جونہی سامنے آتی

سب ہجولی اپنی اپنی غلیل چلاتے

نندی — (گھبرا کر) امّی کہتی تھیں یہ اِک مقدس پرندہ ہے

اس کو نہیں مارتے!

ایک دن میرے بھیا کو امّی نے مارا تھا

وہ فاختہ مار لایا تھا

... ...

ارے! وہ سُنا تم نے!

عبدل — (حیرت سے) کیا ہے نندی؟ کیا ہے؟

نندی — ریل گاڑی ہے!

دیکھو وہ کیا شئے جھلک مارتی ہے!

وہ گھوڑے پہ کون آرہا ہے؟

عبدل — اکبر! اکبر اپنا دوست ہے نندی!

(اکبر ان دونوں کے قریب آکر گھوڑا روک لیتا ہے)

اکبر — سلام بھیا! مزے میں ہو؟ خوب کٹ رہی ہے!

مِلو گے ڈیرے میں!

رات کو تم ضرور آنا!

(اکبر چلنے لگتا ہے)

عبدل — اکبر بھیا! ٹھہرو اکبر! بات تو سُنتے جاؤ۔

حسنی کہیں ملے تو کہنا رات کو ڈیرے میں آجائے!

اکبر —— میں کنج گھر جارہا ہُوں عبدل
تمھارا پیغام بھیج دُوں گا!
بڑی اندھیری ہے آج کی شام
آندھی آئے گی!
(اکبر گھوڑے کو ایڑ لگا کر ہوا ہو جاتا ہے)

عبدل —— اکبر بھی کیا سوچتا ہوگا؟
حسنی نے بھی کئی دِنوں سے مِلنا چھوڑ دیا ہے

نندی —— اُدھر گرد سی اُڑ رہی ہے!

عبدل —— ریت اُڑتی ہے کچھ بھی نہیں ہے

نندی —— نہیں وہ ادھر آرہے ہیں!
چلو اس بَنی کے درختوں میں چھُپ جائیں!
رات ہوگئی ہے!

عبدل —— ڈرو نہیں مَیں ساتھ ہُوں نندی!
اُس تالاب کے پیپل کے نزدیک نہ جانا!
ٹھہرو نندی مَیں بھی آیا!!

پانچواں منظر

(اندھیرے جنگل میں عبدل، نندی کو ڈھونڈتا ہے لیکن نندی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ عبدل تھک ہار کر ایک گھنے درخت کے تنے کے سہارے حیران کھڑا ہو جاتا ہے۔ خاصی رات ہوگئی ہے۔ وہ نندی کے خیال میں کھو جاتا ہے۔)

عبدل — ٹھہرو نندی!
ٹھہرو نندی کہاں چلی ہو؟
رستہ بھول نہ جانا!

نندی — کنویں میں نہ جھانکو!

عبدل — وہ دیکھو وہ ریت پہ بُڑھیاں دَوڑ رہی ہیں!

اکبر — مَیں کنج گھر جا رہا ہُوں عبدل!
تمہارا پیغام بھیج دُوں گا
بڑی اندھیری ہے آج کی شام
آندھی آئے گی!

نندی — ادھر گردی اُڑ رہی ہے
چلو اس بنی کے درختوں میں چھُپ جائیں
رات ہوگئی ہے

(اتنے میں لوگوں کا شور سُنائی دیتا ہے اور وہ جنگل کو آگ لگا دیتے ہیں)

عبدل —— کم بختوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے
کیسے بھاگوں ؟
آگ —— آگ —— آگ
چاروں جانب آگ کا دریا
کہاں ہو نندی ؟
بولو نندی کہاں چھپی ہو !
باہر جاؤں !
لیکن نندی !
نندی مَر جائے گی عبدل !
ایک آواز —— اُلٹے پاؤں پلٹ جا عبدل !
نندی اب نہ ملے گی
اس کی قسمت میں جلنا ہے
اُلٹے پاؤں پلٹ جا !
عبدل —— لیکن نندی ! اُسے اکیلا چھوڑ کے جاؤں !
نہیں نہیں ! مَیں جَل جاؤں گا !
جل جاؤں گا !
جل جاؤں گا !
آواز —— آگ کسی کی میت نہیں ہے
اپنی جان بچا لے عبدل !
نندی اب نہ ملے گی
اندھی آگ کا رستہ چھوڑ کے راتوں رات نکل جا پیارے
وہ رستہ ہے !

اب آواز نہ دینا عبدل !
ندی اب آواز نہ دے گی !
وہ رستہ ہے !
اِس رستے سے دریا کے اُس پار اُتر جا !
آگ کے مُنہ پہ آنکھیں نہیں ہیں
آگ ہے اندھی
آگ ہے بہری !
اپنی جان بچا لے عبدل
وہ رستہ ہے !!

○

چھٹا منظر

(آدھی رات گزر چکی ہے۔ جنگل کی آگ کے شعلے ابھی تک بھڑک رہے ہیں۔ گاؤں بھر میں شور برپا ہے۔ عبدل ویران رستوں میں گرتا پڑتا، چھپتا چھپاتا گھر آتا ہے اور طویلے میں سے اپنے باپ کے کمرے میں جھانکتا ہے۔ عبدل کے ماں باپ آپس میں گفتگو کر رہے ہیں)

کردار

نصیبن ـ عبدل کی ماں : عمر ۵۰ سال

حشمت ـ عبدل کا باپ : عمر ۷۰ سال

(عبدل کھڑکی میں سے سب ماجرا دیکھ رہا ہے)

حشمت ــــ تو کیا یہ بے ہوئی ہے؟
گاؤں والے باؤلے ہیں؟

نصیبن ــــ ان حویلی والوں کے کیڑے پڑیں
ہفت زنگن نے مرے لونڈے کو پاگل کر دیا

حشمت ــــ غضب ہے، قہر ہے جی!
اس بڑھاپے میں یہ دن بھی دیکھنا تھا
مَیں تو اس جینے سے بھر پایا ہوں یا رب
تو اُٹھا لے اب مجھے جلدی اُٹھا لے
اِس بڑھاپے میں یہ صدمہ کوئی دشمن بھی نہ دیکھے

نصیبن ـــــ میرے اللہ لُٹ گئی مَیں
پُوت کا ہے کو جنا تھا سانپ تھا
تم کو اِس دِن کے لیے پالا تھا عبدل!
واہ بیٹا! تم نے اپنے خاندان کا نام روشن کر دیا
باپ دادا کے زمانے کا یہ جنگل ایک دَم میں پھونک ڈالا

حشمت ـــــ کبھی ہم پر بھی آئی تھی جوانی؟

نصیبن ـــــ نہ ہوا اِس وقت میری ماں کا جایا
دیکھ لیتی اِن زمینداروں کا مان!
میرے بیٹے کو اگر کچھ ہو گیا تو شیرے پی لُوں گی اِن کے!

حشمت ـــــ اجی بس چُپ رہو تم!
تم نہ بولو!
تمہارے پیار نے کھویا ہے اُس کو

نصیبن ـــــ کوئی اس دِیدے پھٹی کو پُوچھنے والا نہیں!
کیوں گئی تھی وہ ہنکارا؟
وہ کنوئیں پر کیوں گئی تھی؟

(عبدل سب باتیں سُن رہا ہے۔ کبھی وہ بُوڑھے ماں باپ کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی بدنامی کا ڈراسے ستاتا ہے۔ نندی کے بعد وہ اب گاؤں میں ٹھہرنا نہیں چاہتا)

آواز ـــــ وہ رستہ ہے!
راتوں رات نکل جا عبدل!

عبدل ـــــ لیکن یہ میرا گھر!
یہ میرے ماں باپ!
کہاں جاؤں گا!

نندی! میرے ارمانوں کا آخری سنگم!

آواز ـــــ اب اس پیڑ سے اُڑ جا
اس کی جڑیں اب سُوکھ چکی ہیں
اس کے پھل کو اندر سے کیڑوں نے چاٹ لیا ہے
ہَوا چلے یا پانی برسے
اب اس پھل میں رس نہ پڑے گا
چاند کی کرنیں دستک دے کر
اُلٹے پاؤں پلٹ جائیں گی
چھلکا پیلا پڑ جائے گا
اب اس پیڑ سے اُڑ جا
دُور کسی جنگل میں ڈال بسیرا
کڑوے نیم کی ٹہنی چُن لے

○

ساتواں منظر

(سُورج ڈوب رہا ہے۔ گاڑی پُوری رفتار سے چل رہی ہے۔ عبدل کھڑکی کی طرف بیٹھا سوچ رہا ہے۔ گاڑی کبھی کبھی سُرنگ میں سے یا کسی پُل پر سے گزرتی ہے تو وہ چونک پڑتا ہے۔ احمد اور فیاض دوسری طرف باتیں کر رہے ہیں۔)

کردار

عبدل۔ احمد۔ فیاض۔

عبدل ـــــ (کھڑکی کے باہر چیزوں کو دیکھ کر سوچتا ہے)

رنگ برنگے ذرے بھورے بھورے پتھر
پیلی کرنیں کیکر کی سیڑھی سے اُتر رہی ہیں
کالے ناگ سنہری جیب نکالے! ....

.. ..

خشک پہاڑوں کی چوٹی پر
آڑی ترچھی کالی زرد لکیریں! .. ....
پتھر کے سینے سے چشمے پھوٹ رہے ہیں
کہیں کہیں ہریالی بھی ہے
بھوکی گائیں ـــــ ان کے تھنوں میں دُودھ نہیں ہے
وہ کیا چیز ہے!!

وہی درا ہے
سانجھ سے پہلے اس پر تالے پڑ جاتے ہیں
کون اب اس کی مہریں توڑے !

.. ..

یہ دھرتی اب سارے بندھن توڑ چکی ہے
ایک قبیلہ جاگ رہا ہے
بھیڑوں کو للکار رہا ہے
ایک کرن پھر وقت کی سیڑھی سے اُتری ہے
لیکن مَیں تو —— اس دھرتی میں میرا کوئی نہیں ہے
سات برس کے بعد یہاں سے پھر گزرا ہُوں
وہی پہاڑ اور وہی نظارے
اس وادی میں کیسے اُتروں !
اس دھرتی سے میرا ناطہ ٹوٹ چُکا ہے
اپنے وقت کا اک اک ساتھی چھُوٹ چُکا ہے

.. ..

احمد —— (فیاض سے)
وہ کھڑکی کا شیشہ اُٹھا دو
مرے بھائی باہر ہَوا چل رہی ہے
فیاض —— ذرا گلاس تو بھرنا بھائی !
پیاس لگی ہے —— سارا دن میں کتنے گلاس انڈیل چُکا ہُوں
یہ شیشے کی صراحی تم نے کہاں سے لی ہے ؟
یہ مال تو باہر کا لگتا ہے مُجھ کو

احمد ـــــ یہ سب اپنے ہی کنج گھر میں بنی ہیں
کبھی آپ آئیں تو باہر کی صنعت گری بھول جائیں

فیاض ـــــ پانی تو خاصا ٹھنڈا ہے!
آپ پئیں گے؟

احمد ـــــ بہت پی چکا ہوں!
مَیں گرمی میں پانی ذرا کم ہی پیتا ہوں

فیاض ـــــ وہ دیکھو کھڑکی سے باہر
نُقرے پر اک لڑکا سرپٹ دَوڑ رہا ہے!

احمد ـــــ چال تو خُوب چلتا ہے
لیکن سوار اُس کا بالکل اناڑی ہی لگتا ہے

فیاض ـــــ ہاں کچھ ایسا ہی قصّہ ہے
گھوڑ سواری کھیل نہیں ہے
اپنے پاس بھی دو گھوڑے ہیں
مَیں نے انہیں بچوں کی طرح سے پالا ہے .....

احمد ـــــ مرے پاس بھی ایک چینا ہے
اس میں بڑا دَم ہے بھائی!
بڑا ہی مُبارک ہے یہ چینا گھوڑا
مرے پاس جس دن سے ہے یُوں سمجھ لو کہ بس لکشمی آگئی

فیاض ـــــ یہ بھی وہم ہے
اگلے وقتوں کے لوگوں کی خوش فہمی ہے

احمد ـــــ پُرانی حویلی کے گھوڑے ـــــ مگر وہ تو اُجڑی پڑی ہے

فیاض ـــــ حشمت کا ڈیرہ بھی اب سنسان پڑا ہے

احمد ـــــ بعض گھوڑا تو سچ مچ ہی منحوس ہوتا ہے

فیاض — ہم نے اپنی ساری عمر میں رنگ رنگ کے گھوڑے پالے
چمبا، نقرا، خاکی، چینا، کالا اور کمیت
گھوڑا تو بس قسمت والے کو مِلتا ہے
اس کے کانوں سے جنّت کی ہوا آتی ہے
اس کی ٹاپ سے دھرتی کا دِل کانپ اُٹھتا ہے

احمد — مگر کالے گھوڑے کی کیا بات ہے!
تم نے دیکھا ہے شاید وہ گھوڑا
وہی کالا گھوڑا!
وہ گھوڑا نہیں آدمی ہے!

فیاض — اس خطے کا کون سا گھوڑا مجھ سے چھپا ہُوا ہے
اس میں کوئی گُن ہوتا تو میں کب چھوڑنے والا تھا
جی وہ تو فوج کا کنڈم مال ہے
دیکھنے میں تصویر ہے لیکن ناکارہ ہے
وہ گھوڑا تو بڑا خونخوار ہے!

احمد — تمہیں یاد ہوگا کہ گھوڑوں کے میلے میں پچھلے برس
گاؤں کے چودھری جی نے للکار کے شرط باندھی
کہ اس کالے گھوڑے پہ جو بھی سواری کرے گا
یہ گھوڑا اسی کو ملے گا
تمہیں یاد ہے نا! کہ اکبر سے پتلے چھریرے بدن
کا جواں اس کو اِک آن میں لے اُڑا تھا
ارے یہ پنہ گیر لڑکا تو آفت کا پُتلا ہے
دیکھو تو بھولا سا معصوم سا ہے
مگر وہ گُنی ہے!

فیاض ـــــ گُنی دُنی تو کیا ہے بس قسمت کا دھنی ہے
احمد ـــــ اب تو اکبر نے مونا سے شادی بھی کر لی ہے
اچھے گھرانے کی لڑکی ہے!
فیاض ـــــ لیکن اس میں ایک ہی کھوٹ ہے
نئے زمانے کی لڑکی ہے
کالج تک تو ٹھیک ہے لیکن
وہ تو کھُلے بندوں بے پردہ پھرتی ہے
یہ سب باتیں اپنے کو تو کھلتی ہیں
میاں ہم تو پُرانے لوگ ہیں
احمد ـــــ اجی اب تو نقشہ ہی کچھ اور ہے
وہ زمانہ گیا یہ نئی روشنی ہے
وہ نندی بھی تھی! آگ میں جل بجھی
فیاض ـــــ وہ بے چاری زندہ رہ کر بھی کیا کرتی!
اس کی قسمت میں جل مرنا ہی لکھا تھا
احمد ـــــ تو وہ آگ کس نے لگائی تھی؟
عبدل نے! ـــــ نندی کے بھائی نے! ـــــ حسنی نے!
فیاض ـــــ میاں جتنے مُنہ اتنی ہی باتیں
سُنا یہی ہے!
اللہ جانے تہہ میں کیا ہے؟
احمد ـــــ یہ سارے زمیندار ایسے ہی ہیں
لوگ کہتے ہیں جنگل انہوں نے جلایا
مگر گاؤں والوں کو نندی کے بھائی پہ شک ہے
بھلا آپ اس دن کہاں تھے

فیاض — مَیں اس روز وہیں تھا
اپنے گاؤں میں تھا، بس کھانا کھانے ہی بیٹھا تھا
اتنے میں اک شور سا اُٹھا
مَیں سمجھا کہ ساتھ کے گاؤں نے ہلّہ بول دیا ہے
ننگے بدن گھوڑے پہ الانا چڑھ کے نکلا
اِس سے پُوچھا اُس سے پُوچھا
کالی رات اور تیز ہَوا تھی
تین کوس سے آگ کی لاٹیں چمک رہی تھیں
ڈیرے والے بھرے طمنچے اور بندوقیں لے کر نکلے
گھوڑے سوار مشالیں لے کر بھاگ رہے تھے

احمد — تعجب ہے عبدل کہاں تھا؟
وہ نندی تو جل ہی گئی تھی!
تمہیں تو خبر ہے!

فیاض — آگ کے بہتے دریاؤں میں
اس کی چیخیں ہم نے سُنی ہیں
ہم نے لاکھ پکارا
آوازیں دیں
لیکن کوئی نہ بولا!

احمد — مَیں نے وہ رات دیکھی ہے جب آسماں سُرخ تھا!

آٹھواں منظر

(مرچوں کے کھیت میں حسنی، بندو اور احمد رہٹ کے مُڈھ پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ شام ہو رہی ہے۔ رہٹ چل رہا ہے)

کردار

حسنی۔ بندو۔ احمد۔

اکبر۔ کچھ دیہاتی۔ مُکھیا۔

(رہٹ کی آواز :-

چین مچینا، چین مچینا، چین مچینا کھیت
چین مچینا، چین مچینا، چین مچینا کھیت
بارہ ٹالی ہیٹھ
بارہ گئے پردیس ماں بارہ پھیر بھی آویں گے
چین مچینا، چین مچینا، چین مچینا کھیت
بارہ ٹالی ہیٹھ
بارہ ٹالی ہیٹھ

(حسنی رہٹ کے مُڈھ پر بیٹھا طنبورہ بجا رہا ہے۔ بندو اور احمد حقہ پی رہے ہیں۔ الاؤ کی آگ بھڑک رہی ہے۔)

حسنی ـــــ سانجھ بھئے اک ڈھیر پہ اندھا سادھو روئے
ہم نے نگری چھوڑ دی، ہمیں نہ چھیڑے کوئے

بندو ـــــ سادھو جی اب اُٹھ بھی جاؤ تار طنبورہ چھوڑ
برس رہی اسمان سے کالک تابڑ توڑ

حسنی ـــــ پچھم دیس کے نیل ماں ڈوبن لاگا بھان
اس کی ریکھا دیکھ کے ڈول گئی مری جان
سانجھ اُڑا کے لے گئی سُورج پُور کا رُوپ
کیا جانے کس دیس میں اُترے گی یہ دُھوپ!

بندو ـــــ دُھپ گئی پردیس ماں تلی رہ گئی چھاؤں
مرگھٹ دیکھے گاؤں لے تُو رب کا ناؤں

حسنی ـــــ سُدھ بُدھ ہے مجھے دُھوپ کی نا میں جانوں چھاؤں
نامرا ٹھور ٹھکانا کوئی نامرا کوئی گاؤں

بندو ـــــ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پہ جلنے لاگے پاؤں
کالی رَینا سر پہ کھڑی، چلو چلیں اب گاؤں

احمد ـــــ نہیں بندو بھیّا طنبورہ تو سُن لیں!
بھلا ساز سنگیت کو چھوڑ کر کون جائے!
کبھی نہ کبھی آج فرصت ملی ہے
ارے اور کچھ دیر بیٹھو
ذرا سُرکی دیوی کے جی بھر کے درشن تو کر لیں!
یہ دُنیا کے دھندے تو چلتے رہیں گے

حسنی ـــــ رُت بدلی، آندھی چلی، سوکھن لاگے پات
رنگ برنگی ڈالیاں، رودیں مَل مَل ہات

بندو ـــــ ہائے رے مار دیا، کھوئے دیا ہم نوں
تُو پکا گُن کار ہے بھیا!

احمد ـــــ بھائی جادُو وہی ہے جو سر چڑھ کے بولے
ارے یہ کوئی راج ہیں!
اِن کے گیتوں میں سنسار سنگیت ہے
پھر کہو نا! وہ کیا بول تھے؟
دھیان کس اور پلٹا؟
وہ لوگ اور وہ نقشے جنہیں بھول بیٹھے تھے ہم
آج پھر سامنے آگئے ہیں
وہ دیس اب جو پردیس ہے
آج پھر اس کی مٹی کی خوشبو لویں دے اُٹھی ہے
وہ قصبے وہ گلیاں وہ رستے وہ گھر
جو کھُلے چھوڑ آئے تھے ہم
آج پھر ذہن میں پھر رہے ہیں
سناتے رہو بھائی!
ہم آج ڈیرے نہ جائیں گے!

حسنی ـــــ ایک کونج مَیں ایسی دیکھی اڑے چھوڑ کے ڈار
سانجھ بھئے جس دیس میں اُترے وہاں نہ ہوا اجیار

(حسنی طنبورہ بجا رہا ہے کہ اکبر گھوڑے پر آتا دکھائی دیتا ہے۔ اکبر گھوڑے سے اُتر جاتا ہے)

اکبر ـــــ سلام کرتا ہُوں!
ہیں یہ کیا ہو گیا ہے تجھ کو؟
مَیں صُبح سے تجھ کو ڈھونڈتا پھر رہا ہُوں پیارے!
وہ کنج گھر تیری جان کو رو رہا ہے حسنی!
اُدھر وہ عبدل ہے جانے کس روگ میں پھنسا ہے؟
یہ کام کیسے چلے گا پیارے؟

بندو ـــــ اکبر بھیّا! عبدل کی کچھ کھیر کھبر ہے؟

اکبر ـــــ بڑے مزے میں ہے شاہ زادہ!
ابھی ملا تھا
ارے وہ کیا ہے
وہ دیکھو! آکاش پر وہ کیا ہے؟

حسنی ـــــ آگے پیچھے بھاگتے تارے!

بندو ـــــ ایک دو تین اور چار پانچ!

حسنی ـــــ وہ چھ! اور وہ سات!!
رنگ برنگے گربڑے آگ کے پنکھ لگائے
گھُپ اندھیری سانجھ ماں کس نے یہاں اُڑائے؟

اکبر ـــــ نہ جانے کس دیس سے اُڑے ہیں؟
نہ جانے کس دیس میں گریں گے؟

حسنی ـــــ جانے کسی کا بیاہ رچا ہے اتنے چوکھے رنگ
بُرج چڑھے آکاش پر ارمانوں کے سنگ
ایسے رنگ گلال میں، کیا اپنا من کھوئے
جانے اس کی اوٹ میں کوئی جلتا ہوئے؟

بندو ـــــ کیسے بول بچارو حسنی دیکھ کے پیار کا جھکا؟
کیا کہنا ہے تم کا؟

حسنی ـــــ ڈھور ہنکاتے پھیر ماں کیسی کرے بچار؟
بندو تو ہے جا گنوارو تو کیا جانے پیار؟

(دُور سے کنج گھر کے سائرن کی آواز سنائی دیتی ہے۔ سناٹا اور پھیل جاتا ہے۔ کنج گھر کے مزدور اور کاری گر دُور سے ایک رستے پر تیزی سے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں)

اکبر ـــــ سناؤ کیا حال ہے مرے دوستو تمہارا؟

بندو ـــــ اتنے دنوں ماں سکل دکھائی
اچھے تو ہو میرے بھائی؟

اکبر ـــــ خدا کے فضل و کرم سے اچھی گزر ہی ہے!
سناؤ احمد تمہارا کیا حال ہے
کہو کیسی کٹ رہی ہے؟

احمد ـــــ عنایت ہے بس آپ کی!
آؤ کچھ دیر بیٹھو! یہ حقہ ابھی بھر کے رکھا ہے
حقہ تو پیتے ہو تم بھی!
ارے آج حسنی نے وہ رنگ باندھا کہ بس!
یار اس کے گلے میں قیامت کی مُرکی ہے
گھنگرو کا کھٹکا ہے!
ظالم نے کوئل کی آواز پائی ہے

اکبر ـــــ (کھیتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے)
نہ جانے یہ جنگلی کبوتر کہاں سے اُترے ہیں اُجڑے بن میں؟
کبوتروں کی یہ ٹکڑیاں ہیں کہ ٹڈی دل ہے!
بڑا اندھیرا ہے بھائی احمد!
کہاں چلے ہو؟

احمد ـــــ ذرا دو کبوتر گرا لاؤں!
بس پل جھپکنے میں آجاؤں گا!

اکبر ـــــ خدا کو مانو!!
یہ شام کے وقت ان پرندوں کو کیوں ستاتے ہو!
جانے دو! غیر وقت ہے!!

بندو —— بڑا ہی بھولا پنچھی ہے یہ، سیدا اس کی ذات
بھرے سمے مت مارو اس کو مانو میری بات!
حسنی تم کوئی گیت سناؤ!
بابوجی کا جی بہلاؤ!

اکبر (حسنی کی طرف دیکھ کر طنز سے کہتا ہے)
بڑے مزے میں ہے آج حسنی!

بندو کنج گھر ماں چھٹی ہو گئی گھگو شور مچائے
اپنے اپنے ٹھار کو، خلقت دوڑی جائے
گھراں کو بھاگے چودھری، ٹھاکر اور رجمان
ہری بھری نگر پیلیاں، چھوڑ گئے کرسان
مٹی سے جل جو گئی، اڑ گئی چھوڑ کے باس
پگلی بل بتوریاں، بولیں مڑھی کے پاس

اکبر ارے او بندو! ذرا ادھر چھینٹیاں تو لانا!
الاؤ ٹھنڈا پڑا ہے بھائی!
یہ کیا خبر تھی کہ اس اندھیرے میں دوستوں کی سبھا جمے گی
نہیں تو کمبل ہی لیتے آتے

بندو کمبل کو نہیں جانتے، گاؤں کے سیدھے لوگ
ہم تو نرے گنوار ہیں، تم ہو سہری لوگ

اکبر بھلا کبھی تم نے شہر دیکھا ہے؟
جانتے ہو کہ شہر کیا ہے؟
کبھی جو سپنے میں دیکھ پاؤ تو گاؤں کی ناریوں کو بھولو!

احمد میاں باؤلے ہو کے روتے پھرو گے!
ارے شہر کی ناریوں سے خدا ہی بچائے!!
ذرا آگ کے پاس آجاؤ ٹھنڈی اترنے لگی ہے!

سُنا تُم نے حسنی !! یہ آواز کس کی ہے ؟
(بندُو سہم جاتا ہے)

بندو —— یہ بولے جس گاؤں ماں پھر نہ بسے وہ گاؤں
یار داب نہیں بولن، یہاں کسی کا ناؤں

احمد —— میاں تم تو وہمی ہو بندو!

بندو —— تم نے پھر مرا ناؤں لیا!
مَیں کہتا ہُوں ناؤں نہ بولو!

حسنی —— چڑیاں ترسیں گھونٹ کو دھرتی دُھول اُڑائے
تم رہو اس دیس میں ہم سے رہا نہ جائے

آواز —— بندو —— ہو —— بندو

بندو —— ہوت —— چاچا —— ہوت - کیا بات ہے ؟

چکّی کی آواز —— ٹُک چُھک ٹُک چُھک ٹُک چُھک
ٹُک چُھک ٹُک چُھک ٹُک چُھک

احمد —— یہ آٹے کی چکّی ابھی تک یونہی چل رہی ہے !
یہ چکّی میں کیا پس رہا ہے ؟
—— مگر گاؤں بھر میں دہائی مچی ہے کہ آٹا نہیں
کال ہے، لوگ مرجائیں گے
لوگ بھوکوں مرے جارہے ہیں!

بندو —— ندیاں سُوکھیں کال ماں، ہڈی کھاگئی دھان
پیٹ پُجاری شہر کو بھاگے، بھوکوں مریں کسان

احمد —— چلو! شہر میں چل کے ڈیرہ لگائیں!
مگر بھائی! ہم تو ہنر گیر ہیں
شہر میں کیا کریں گے ؟

وہاں ان دنوں کام بنا بھی مشکل ہے
اپنا کوئی یار ڈپٹی کلکٹر ہی ہوتا
نہیں یار! اب تو یہیں مَر رہیں گے
اسی گاؤں میں گھر بنائیں گے
اب تو یہی تھل بسائیں گے

بندو —— سہر مرے کیا پھونکنا، دیکھے سہر کے لوگ
گیا تھا کنکو بیچنے، لے آیا کیا روگ ؟

احمد —— یہ سب نفع خوروں کی سازش ہے
غلّے کا توڑا نہیں!
اپنے کھیتوں کو دیکھو!
ذرا اپنی فصلوں کو دیکھو!
ہری ہیں، بھری ہیں!
مگر یہ زمیندار، یہ کالی منڈی کے تاجر!

اکبر —— یہ دُکھ بھری رات کیسی کالی ہے ؟
آج تاروں کی سُمرن کس کو ڈھونڈتی ہے!
اداس تاروں کی سُمرن کو جگاؤ حسنی!
گئے سمے کو بلاؤ حسنی!
سُناؤ حسنی!

(حسنی طنبورہ چھیڑتا ہے، بندو حقّے کے نیچے کو پکڑ کر اپنی چاندی کی انگوٹھی سے حُقّے کا پیندا بجاتا ہے)

حسنی —— بنیا باجے۔ تنا نوم تنا نوم
جھانجن بولے چھَن
تو چُپکے چُپکے آ گوری!

اس گھور اندھیری رین ماں
جوں کجرا ناچے نین ماں
تُو چُپکے چُپکے آ گوری !
(بندو چونک کر کھڑا ہو جاتا ہے)

بندو —— دیکھ تو حسنی !
یو کیسی پگھم پگھی !

(بارہ سوار سامنے سے گرد اُڑاتے ہُوئے آتے ہیں۔ اندھیرے میں ان کی سفید پگڑیاں اور گھوڑیوں کی آنکھیں چمکتی ہُوئی نظر آتی ہیں۔ اگلے دو سواروں نے اپنے ہاتھوں میں جلتی ہُوئی مشالیں اُٹھائی ہُوئی ہیں۔)

بُلّھا —— دوڑیو رے ! دوڑیو !
دوڑیو رے ! ——
(گھوڑے سوار الاؤ کے قریب آجاتے ہیں)

دوسری آواز — کون ہے یو اس اندھیری رات ماں ۔ ہو
یو الاؤ کِن نے جالا ؟
لائیو رے میرا بھالا ؟

تیسری آواز — ہوت پنچیئے ! کون ہے گا تو ؟

چوتھی آواز — بُلّے بیرا گھوڑی موڑ لے !
آندھی چلنے لاگی !

بندو —— کون ہے بھائیا ؟ کیا بات ہوگئی ؟

چوتھی آواز — ہو ! وا عبدل تھانا بندو !
بیر کاڈ کے لے گیا سالا !
ہوا کی مافک چل دو یار دو
پھیر دا ہتھ نہ آیا

(گھوڑے سوار آن کی آن میں ہوا ہو جاتے ہیں۔ آندھی تیز ہو گئی ہے۔
اکبر، احمد، حسنی اور بندو کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہے۔)

بندو —— حسنی بھیا یہ ہے پریم کا سودا
مرے یار کی ساری جندگی برباد

حسنی —— تم ٹھہرو اسی بات پہ، ہم چلے پی کے دوار
احمد تو مرے ساتھ چل کہیں کھو نہ جاوے یار

احمد —— مگر میں تو عبدل سے واقف نہیں
اس کی صورت بھی دیکھی نہیں آج تک!
خیر! تیری خوشی ہے تو چلتے ہیں
یارو یہیں راستہ دیکھنا ہم ابھی آئے!

(ٹاپوں کی آواز)

اکبر —— بڑی حماقت ہے!
اس اندھیرے میں کس کو ڈھونڈو گے میرے بھائی!
مجھے تو ڈر ہے کہ آج عبدل پہ کوئی آفت نہ آن ٹوٹے
بڑی بُری بات کی ہے اُس نے!
بڑی بُری بات کی ہے اُس نے!

نواں منظر

(حسنی اور احمد سُورج پور سے دو میل کے فاصلے پر جنگل کے شمالی حصّے کے ساتھ ساتھ گھوڑوں پر بیٹھے عبدل اور نندی کی تلاش میں پھر رہے ہیں۔ اندھیری رات ہے۔ سناٹا ایک حادثے کی طرح پھیلتا جا رہا ہے۔ احمد اور حسنی کے گھوڑے دوڑ دوڑ کر پسینہ پسینہ ہو گئے ہیں)

کردار

احمد۔ حسنی۔ ناری۔

احمد ـــــ تمہارا تو سَر پھر گیا ہے!
ارے مَیں بہت تھک گیا ہُوں۔
میری انتڑیاں قل ہو واللہ پڑھنے لگی ہیں

حسنی ـــــ بھانبڑ جلے سریر ماں رنگ اچھالیں نین
من دیپے جس رین ماں، وہی نہ ہو یہ رین!

احمد ـــــ بھلا اس اندھیری بَنی میں تمہیں کیا ملے گا؟
تمہیں جان پیاری نہیں؟

حسنی ـــــ موت کھڑی جس باٹ پہ وہی ہے میری باٹ
گُرو جی میری دھیر بندھاؤ مَیں اُتروں کس گھاٹ؟

احمد ـــــ آؤ ندی کے اُس پار اُتریں!
اُدھر ایک رستہ ہے

حسنی ـــــ (احمد سے)

من کی اکھیاں کھول کے دونوں اکھیاں میچ
پھوٹے گا پھر چاندنا، ندی کے بیچو بیچ

احمد —— ارے یہ تو جادُو کی دھرتی ہے!

حسنی —— دھرتی اُوپر نیلا گگن، گگن پہ ناچیں پھول
ان کی چھایا دیکھ کے، جل میں جلیں بھنبول

(حسنی اور احمد کے گھوڑے چلتے چلتے ایک دم رُک جاتے ہیں۔ حسنی اور احمد بہت کوشش کرتے ہیں لیکن گھوڑے آگے نہیں چلتے۔ دونوں گھوڑے اگلے پاؤں اُٹھا کر ہنہناتے ہیں اور خُرخُر کرتے ہیں اور اپنی کنوٹیاں جلدی جلدی گھماتے ہیں۔ احمد بہت اصرار کرتا ہے لیکن حسنی واپس جانے سے انکار کر دیتا ہے۔)

احمد —— ارے وہ اُدھر آگ!.....
اُس آگ کے پاس.....اک آدمی زاد!.....

حسنی —— گگن سے اُڑ کے دھرت پہ آیا کیسے رنگ گلال!
کال، پیلی، گیروی، مٹی ہوگئی لال

احمد —— (خوف زدہ آواز میں)
خدا جانے یہ کون ہے؟
یار آگے نہ جاؤ!

حسنی —— دَہڑ دَہڑ جلے سُوکھی لکڑی جگر جگر انگار
آگ کی اُٹھتی لاٹ سے، نکلیں سُرخ انار
بھبھل ملے سریر پہ، ننگی بیٹھی نار
نِس اندھیاری رین ماں یہ کیسا اجیار!

(حسنی اور احمد جلدی سے الاؤ کے قریب آجاتے ہیں۔ دونوں گھوڑے پر سوار ہیں۔ حسنی آگے ہے۔ ایک ننگ دھڑنگی عورت بدن پہ راکھ ملے بالوں سے منہ چھپائے سر جھکائے سنسان بیٹھی ہے۔ وہ ان کی طرف بالکل توجہ نہیں

دیتی۔ پہلے تو حسنی اور احمد ڈر کے مارے سہم جاتے ہیں۔ حسنی عورت سے مخاطب ہوتا ہے)

حسنی — اگنی برن کی اوٹ ماں، اپنا بدن چھپا
او ناری! او مورکھ ناری اپنا ناؤں بتا!

ناری — (بڑی ڈراؤنی اور گہری آواز میں)
ناری نہیں، چڑیل ہوں، اپنی جان سنبھال
کھائے لوں گی ترا کالجہ، جیوڑا لوں گی نکال

حسنی — تو مجھے نئیں پچھانتی، میں ہوں منش دلیر
ایسا بھالا ماروں گا بس کردوں گا ہیں ڈھیر

ناری — تو مجھے نئیں پچھانتا باپ مرا مہاراج
میں ہوں مہار جیوتنی، گیت مرا سرتاج

حسنی — تو ہے کس مورکھ کی پتنی کون ترا سرتاج؟
کس کے کارن پھونک دی تونے اپنی لاج؟

احمد — (حسنی کا شانہ پکڑ کر کہتا ہے)
مرے بھائی نرمی سے بولو!

ناری — ناری سے جب بولیے، کہیے میٹھی بات
جیب سنبھال کے بول رے مورکھ کھول نہ اپنی ذات!
"کون دِسا سے آیا ہے تو کون دِسا کو جا!
بھالا لے ریا ہاتھ ماں گھوڑا ریا نچا"

حسنی — میں ہوں ایک ستاریا کھو گئی میری ستار
نگری نگری گاتا پھروں، لوگ کہیں گُن کار

ناری — گُنی ہے تو گُن کاری ہے تو کوئی گُن دکھلا
سُرتی رُوپ کو من میں بٹھا کے موہن گیت سُنا!

حسنی —— تار طنبورے بن او ناری کیسے گاؤں گیت؟
اُجڑے بن کی باس ہے، سنگت بن سنگیت

ناری —— بین نہ باجے تار بن، من باجے بن تار
بین بنا جو گیت سناوے وہی بڑا گن کار
چندر، پانچ کی چھیڑ سے سُرتی رُوپ دکھا
سات سُروں کی راگنی اک تارے پر گا

احمد —— میرے بھائی کچھ تو سناؤ!

حسنی —— ایک ناریں ایسی دیکھی پہر پہر کرے بین
اس کی اکھیاں دیکھ کے بھور بھی دیکھے رین
گورا مکھڑا پیازی برن، چندے چھٹّے بیر
پل پل اُس کے دھیان ماں نو انبر کی سیر
کس کے کارن جوگن بنی، کیوں چھوڑا گھر بار؟
اپنا محل بتاؤ دے، او دکھیاری نار!

ناری —— "محل تجھے بتاؤں تی" کھڑی ہوں تن من ہار
"بجلی پڑ دا اِن محلوں پر، تم پر پڑ دا انگار"

احمد —— ارے آگ!
یہ آگ! —— یہ شور

(گھوڑے کے ٹاپوں کی آوازوں اور لوگوں کے شور سے جنگل گونج اٹھتا ہے۔
آگ کے شعلے آسمان تک بلند ہو رہے ہیں۔ عورت جنگل کی طرف بھاگ جاتی ہے
اور حسنی اس کے پیچھے بھاگتا ہے)

○

دسواں منظر

(رات ہوگئی ہے۔ چاروں طرف سے جنگل دَہڑ دَہڑ جلتا ہے۔ اک عجب بھگدڑ مچی ہے)

کردار

کچھ لوگ۔

احمد۔

شیشہ گر۔ (کنج گھر کا انجینئر عمر تقریباً ۵۰ سال)

بُلّھا۔

حسنی

آوازیں :

۱ ـــــ وہ اُدھر بھاگا!
ارے پکڑو اُسے! جانے نہ پائے

۲ ـــــ بڑا اندھیر ہے میرے یارو
بستے گاؤں کی بیٹی کاڈکے لے گیا حسنی!

۳ ـــــ مُنے اپنی انکھ تے دیکھا واحسنی تھا
حسنی ہور نندی دونوں تھے

(احمد آگ کے شعلے دیکھ کر ہجوم میں شامل ہوجاتا ہے)

احمد ـــــ آگ کس نے لگائی تھی بھائی!
بلا کچھ پتہ؟

آوازیں: ۱ ـــــ یو قصہ تو بڑا ٹھاڑا ہے!

(کچھ لوگ حسنی کا گھوڑا گھیر کر اسے ہجوم میں لاتے ہیں۔)

۱ ـــــ یارو! اس کی ہڈی پسلی توڑ کے رکھ دو۔

۲ ـــــ اِس کے سَر ماں مارو دو گاڑا!

احمد ـــــ خبردار! کیوں مارتے ہو؟
گرفتار کر لو، پولیس کے حوالے کرو
اپنے ہاتھوں میں قانون لینا حماقت ہے

۱ ـــــ بڑا حمیتی آیا اس کا!
چُپکرا ہو جا!!

احمد ـــــ مگر پہلے تحقیق کر لو
عدالت کھُلی ہے، عدالت کا در کھٹکھٹاؤ!

۱ ـــــ پیچھے ہٹ جا! اپنی بُوتھی پرے نوں کر لے!

شیشہ گر ـــــ بھلا یہ بھی کوئی شرافت ہے
اسے اپنے ہاتھ سے مت مارو!
یہ کام عدالت پر چھوڑو!

بُلّھا ـــــ یو میرا مُجرم ہے یارو!
اِن نوں میرے پاس لیاؤ!
(بُلّھا حسنی کو خون بھری آنکھوں سے دیکھ کر بولتا ہے)
تُو اگر اشراف ہے تو آ اُتر میدان ماں
سید ہے تو، رجپوت مَیں!
تُو پہلے اپنا وار کر پھر روک میرے وار کو
مَیں یُوں نہ چھوڑوں گا تجھے!

حسنی — مَیں نردوش ہُوں بلھے بیرا میرے حال سے جا پنچھ
سانچ کے آگے جھُوٹ نہ ٹھہرے نئیں ہے سانچ کو آنچ
سیدا ایسا نئیں ہے بُلھے تو کیا جانے اس کی سُکھ
جس کے سنگ جلی تری بھینا وہ بھی ہوئے گیا راکھ
تیرے میت ہیں سینکڑوں، پنچ تن میرے ساتھ
تیرے پاس گنڈاسیاں مَیں ہُوں خالی ہاتھ
دُھومن شاہ کی سَوں ہے بلھے میرا نئیں قصور
مَیں لڑنا نہیں چاہوتا مجُھے نہ کر مجبور
۱ — بیّر کا دِن لاگے تنّنے سرم نہ آئی!
راج کوری اِب آجا بیچ مدان ماں!
بلھا — مَیں تجھے زندہ نہ جانے دُوں گا حسنی!
فیصلہ کرلے یہیں!
یا تُو نہیں یا مَیں نہیں!
حسنی — میرا پیر علیؑ مولا ہے ہور انگڑ کے چھور
آجا بیچ مدان ماں دیکھوں تیرا جور

○

گیارہواں منظر

(صبح کا وقت ہے۔ اکبر، احمد کنج گھر کے ایک کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ کنج گھر سُورج پُور سے پرا میل کے فاصلے پر ہے۔ پہلے اس کے حصہ دار اور مالک عبدل اور حسنی تھے پھر ہجرت کے بعد اکبر ان میں مل گیا۔ اب عبدل اور حسنی کے بعد اکبر اور احمد اس کے مالک بن گئے ہیں۔ کنج گھر میں بہت سی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ اس کے چاروں طرف نواں شہر آباد ہو گیا ہے بہت سے کاریگر اور مزدور بدل گئے ہیں اور اس کا کام بھی ذرا پھیل گیا ہے۔ لیکن کنج گھر کا انجینئر وہی ہے)

زمانہ : ہجرت کے بعد

کردار

احمد۔ اکبر۔ شیشہ گر۔

کنج گھر کی آواز :

کھڑانک ٹرک ٹرک چھک چھک
کھڑانک ٹرک ٹرک چھک چھک
کھڑانک کھڑانک ٹرک ٹرک چھک چھک
کھڑانک کھڑانک ٹرک ٹرک چھک چھک

(اکبر اور احمد، حسنی کے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ ایک شیشے کی الماری میں حسنی کی چتر بین خاموش پڑی ہے۔ حسنی کے بعد اسے کسی نے نہیں چھیڑا۔ اکبر اور احمد، بینا کو دیکھتے ہیں اور کچھ دیر خاموش رہتے ہیں)

(احمد کو حسنی کا خیال آتا ہے)

بینا باجے تنانوم تنانوم
جھانجن بولے چھن
بینا باجے تنانوم تنانوم

احمد —— (میز پر رکھے ہُوئے (PAPER WEIGHT) کو دیکھ کر اکبر سے مخاطب ہوتا ہے)
یہ شیشے کی بٹی !
یہ شیشے کی بٹی میں رنگوں کے آنسو !
یہ کیا بلبلے سے چمکتے ہیں دیکھو !

اکبر —— ذرا سی بٹی میں ایک دُنیا بسی ہُوئی ہے
نظامِ شمسی کے سارے رشتے سمٹ گئے ہیں
یہ ایک ننھا سا آسماں ہے
اُسی طرح صاف اور شفاف اُجلا اُجلا !
یہ کھڑکیاں اور یہ کھڑکیوں کے سفید شیشے
سفید شیشوں سے روشنی کی پھوار چھن چھن کے گر رہی ہے
یہ روشنی دائروں کے اندر !
یہ دائرے روشنی کے اندر !
یہ روشنی کے سفید نقطے !
چہار جہتی زماں کا دھارا
خموش چیزوں کو لے اُڑا ہے
یہ روشنی معجزے کی صورت اُتر رہی ہے
خموش چیزیں بھی چل رہی ہیں

احمد —— چلو کنج گھر کی مشینیں تو دیکھیں

(شیشہ گر کمرے کے اندر آتا ہے اور احمد اور اکبر کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگتا ہے)

(مشینوں کی آواز دُور سے آرہی ہے۔)

کھڑنک کھڑنک چھک ٹرک ٹرک
کھڑنک کھڑنک چھک ٹرک ٹرک

شیشہ گر — کیوں بھائی سوچ لیا تم نے ؟

اکبر — مجھے تو منظور ہے سبھی کچھ
اب آپ احمد کو راضی کرلیں !

احمد — مجھے کوئی انکار ہے میرے بھائی !
جو یاروں کی مرضی وہی میری مرضی !

شیشہ گر — اب آپ ہی فیصلہ کر لیجیے کہ عبدل اور حسنی
کے حصّے کیسے بٹیں ؟
ان کا تو کوئی وارث بھی نہیں !
حق دار تو اس کے آپ ہی ہیں
لیکن ذرا سوچ سمجھ لینا !

احمد — مگر آپ کا بھی تو حصّہ ہے اس میں !

اکبر — بجا ہے بھائی ! تمہاری محنت ہمارا پیسہ !

احمد — تو پھر تین حصّے ہُوئے۔
کچھ تو اللہ کے رستے میں دے دو !
جو باقی بچے اس کو تینوں میں تقسیم کر لو

اکبر — تو اتنی جلدی ہی کیا ہے احمد ؟
میرا تو دِل کانپتا ہے جب بھی خیال آتا ہے دوستوں کا
یہ حصّے وِصّے کی بات چھوڑو !
جو کام کرنا ہے کرتے جاؤ !

احمد — مَیں قانون کی رُو سے کہتا ہُوں

ورنہ میرا دِل بھی دُکھتا ہے
حسنی بھی اپنا بڑا یار تھا
اور عبدل تمہارا بڑا دوست تھا
بلکہ دونوں تمہارے ہی ساتھی .....
مگر خیر! چھوڑ دو یہ باتیں!
ذرا کنج گھر تو دکھا دو!

اکبر ـــــ (شیشہ گر کی طرف اشارہ کر کے)
یہ شیشہ گر ہیں انہیں سے کہیے!
بڑی ہی مِنت سے مَیں نے ان کو منا لیا ہے
کہ کنج چھوڑ کر نہ جائیں

شیشہ گر ـــــ چلو پہلے مشین کو دیکھیں ہم!

احمد ـــــ تو یہ کنج گھر کیسے چلتا ہے؟
ٹُرک چھک چھک
ٹُرک چھک چھک

شیشہ گر ـــــ یہ موٹر ہے! ـــــ بجلی کے زور سے چلتی ہے
یہ دو بڑی چرخیاں سب سے پہلے گھُومتی ہیں!
چرخی گھُم گھیریاں کھاتی ہے اور باقی پہیے گھُومتے ہیں
پھر ان کے ساتھ ہی چھوٹے بڑے سب پُرزے چلنے لگتے ہیں
یہ چمنی ہے! ـــــ چمنی میں ایندھن جلتا ہے
ایندھن کوئلے کا ہوتا ہے ـــــ لکڑی اور پتھر کا کوئلہ!
یہ بھٹی ہے! ـــــ بھٹی میں شیشہ پگھلتا ہے اور سانچوں میں گرتا رہتا ہے
یہ کئی قسم کے سانچے ہیں!

ان سانچوں میں ہر طرح کی چیزیں بنتی ہیں
یہ پرچ پیالے، یہ کوزے، یہ جھاڑ یہ قیف
یہ نلکیاں یہ گل دان یہ جگ، سوڈے کی بوتلیں
اور گلاس، یہ سارے کانچ سے بنتے ہیں!

احمد — یہ شیشوں کے تختے!
یہ شیشہ بھلا کس طرح کاٹتے ہیں؟

شیشہ گر — یہ ٹھوس حجم نازک شیشہ ہیرے کی قلم سے کٹتا ہے
شیشے کی نازک چادر کو نوکیلے کھُردرے کنکر سے بھی کاٹتے ہیں
ہیرے کی قلم کبھی دیکھی ہے؟
اس شیشے کو پیمانہ رکھ کر کاٹتے ہیں
ہیرے کی قلم سے تیز لکیر لگاتے ہیں
پھر دونوں طرف سے شیشے کو ہاتھوں سے دبا کر توڑتے ہیں
یہ کام بڑا ہی نازک ہے!

احمد — مگر یہ بتاؤ کہ شیشہ پگھلتا ہے کیسے؟

شیشہ گر — پہلے تو کانچ کی کرچیوں کو یا کانچ کے چھوٹے ٹکڑوں کو
بھٹی کے اندر ڈالتے ہیں
پھر چاروں طرف سے بھٹی کو ڈھک دیتے ہیں
یہ بھٹی جوں جوں تپتی ہے شیشے میں لرزش ہوتی ہے
پہلے تو ایک ہی نقطے پر اک تھرتھری ہونے لگتی ہے
پھر تھرتھری بڑھنے لگتی ہے اور ذرے ہلنے لگتے ہیں
ذروں میں کھلبلی مچتی ہے
پھر ذرے آگے اور پیچھے کیڑوں کی طرح سے رینگتے ہیں
یوں شیشہ پگھلتا رہتا ہے

سانچوں میں ڈھلتا رہتا ہے
اور چیزیں بنتی رہتی ہیں
یہ ریشم سے اُلجھے اُلجھے لچھے سے جو تم دیکھتے ہو
یہ سانچوں میں سے اُچھل کر باہر گرتے ہیں

احمد ـــــ بڑا ہی ادق کھیل ہے شیشہ سازی!
مَیں کتنے دن میں اسے سیکھ لوں گا!

شیشہ گر ـــــ دُنیا جسے شیشہ کہتی ہے وہ ایک طرح کا پتھر ہے
یہ شیشہ جو تم دیکھتے ہو پتھر کے دِل کا جوہر ہے
جو رنگ نظر آتے ہیں تمہیں اس شیشہ سازی کے فن میں
کبھی آنکھیں موند کے دیکھو تم، یہی رنگ ہیں دِل کے درپن میں
مجھے شیشہ گر ہی نہ سمجھو تم مرا شیشہ پھوٹ نہیں سکتا
مَیں جوہری ہُوں جس جوہر کا وہ جوہر ٹوٹ نہیں سکتا
آپ آتے رہیں تو چند دنوں میں سارا کھیل سکھا دُوں گا
اس شیشہ گری کی صنعت کے سب راز رموز بتا دُوں گا

○

بارھواں منظر

(نویں شہر میں اکبر، مُونا اور احمد دو پہیوں کی گاڑی میں پھول گلی سے کنج گھر کی طرف جا رہے ہیں۔ گاڑی کو دو سفید گھوڑے کھینچ رہے ہیں۔ گرمیوں کی دوپہر ہے۔ ایک عورت بھیرویں گا رہی ہے۔ اس کی آواز دُور سے آ رہی ہے۔)

کردار

ایک عورت۔
مُونا۔ عمر ۲۲ سال
اکبر۔
احمد۔

گاڑی کی آواز:

رِک ٹِک رِک ٹِک
رِک ٹِک رِک ٹِک
رِک ٹِک رِک ٹِک

عورت کے گانے کی آواز:

کنچن رُوپ دکھائے
سرگم سا (سارے گاما سا)
جل میں آگ لگائے

چھم چھم ناچے کھڑی دوپہری
دُھوپ کی تانیں گہری گہری
سرگم سا

جل میں آگ لگائے
سُر کی چھایا سُر سے آگے
سُر کے پیچھے سُرتی بھاگے
سرگم سا

سُر کی تھاہ نہ پائے
کنچن رُوپ دکھائے
سرگم سا

جل میں آگ لگائے

مُونا ـــــ گاڑی والے گاڑی روکو
احمد بھیّا نیچے اُترو!

احمد ـــــ یہ کس کا جنازہ ہے اکبر؟

اکبر ـــــ ہمارے مفتی گزر گئے ہیں
یہ آخری شمع رہ گئی تھی!

○

تیرھواں منظر

(گاڑی اُڑی جارہی ہے۔ رات ہوگئی ہے۔ سُورج پوراب تھوڑی دُور ہے۔
احمد اور فیاض بدستور باتیں کر رہے ہیں اور عبدل گہری سوچ میں سر جھکائے بیٹھا ہے)

کردار

احمد۔ فیاض۔ عبدل۔

احمد —— کئی بار تم سے کہا ہے کہ کھڑکی کا شیشہ اُٹھا دو
یہ شیشہ اُٹھا دو نا بھائی!

فیاض —— کون ہے وہ پھر تم ہی بتاؤ!

احمد —— ارے ہاں! وہ اندھی بھکارن!
خدا جانے وہ کون ہے؟

فیاض —— سات برس میں اس دھرتی کی ایسی کایا پلٹی!
پہلے جنگل راکھ ہُوا، پھر کال پڑا
سیلاب تو بس ایسا آیا کہ توبہ میری!
سُورج پور میں کیا رکھا ہے؟

احمد —— پُرانی حویلی بھی اُجڑی پڑی ہے
وہ ڈیرہ تو حشمت کے دَم سے ہی تھا بس!
تمہیں یاد ہے جب وہ سیلاب آیا تھا
اُس رات عبدل کے ماں باپ، بُتھے کا کنبہ

خدا جانے کتنی ہی مخلوق اس راؤں میں بہہ گئی

فیاض ـــــ بندو اور مَیں کشتی لے کر سب سے پہلے عبدل کے ڈیرے میں پہنچے
حشمت بادا اور نصیبن گھر سے نہ نکلے

احمد ـــــ مَیں بھی اس رات اکبر کو لے کر گیا تھا مگر وہ نہ مانے!
اجی یہ پُرانے زمانے کے بُوڑھے کسی کی نہیں مانتے
خیر اچھے تھے وہ لوگ!
دُنیا میں اب ایسی شکلیں کہاں ہیں؟

فیاض ـــــ حسنی آپ کے ساتھ تھا جس دِن آگ لگی تھی؟

احمد ـــــ مَیں بندو کے ہمراہ مرچوں کی پیلی میں بیٹھا ہُوا تھا
کہ حسنی طنبورہ لیے آگیا
ہم وہیں رہٹ کے مڈھ پہ سنگیت سُننے لگے تھے
کہ اکبر بھی گھوڑے سے اُترا
وہ شام اب کبھی یاد آتی ہے تو کانپ جاتا ہُوں بھائی!

فیاض ـــــ حسنی آپ کے ساتھ تھا لیکن
نندی کس کے ساتھ گئی تھی؟
عبدل پھر کیوں بھاگا؟....

احمد ـــــ ہاں تو مَیں کہہ رہا تھا
اندھیرا اُترنے لگا تھا کہ اتنے میں ٹاپوں کی آواز آئی
وہ عبدل کے پیچھے لگے تھے!
اِسی وقت مَیں اور حسنی بھی گھوڑوں کو لے کر چلے
رات کے کوئی نو دس بجے تھے کہ ندی کے
اُس پار جنگل میں جلتا الاؤ دکھائی دیا
گھوڑے چلتے نہ تھے اور ہم جان ہتھیلی پہ لے کر اُدھر چل پڑے

پاس پہنچے تو دیکھا الاؤ پہ اک نار بیٹھی تھی'
جلتے الاؤ کے نزدیک عریاں بدن ایک عورت
پریشان بالوں سے مُنہ کو چھپائے'
خدا جانے وہ کون تھی!

فیاض — اچھا اچھا! یہ عورت ....
وہ — تم نے کچھ پُوچھا تھا اُس سے
وہ کیا بولی؟

احمد — ہم نے پوچھا تو کھانے کو دوڑی
ڈرانے لگی اور کہنے لگی "ڈین ہُوں
دُور ہو جاؤ ورنہ کلیجہ چبا لُوں گی"
پہلے تو ہم ڈر گئے پھر ذرا بڑھ کے حسنی نے نیزہ سنبھالا
وہ تھرا گئی زرد سی پڑ گئی

فیاض — پھر آگے کیا بات ہُوئی یہ بھی تو بتاؤ؟

احمد — ہم نے اُس سے بڑی دیر تک گفتگو کی

فیاض — مَیں جانوں وہ کوکھ جلی تھی
جادُو ٹُونہ کرتی ہوگی!
آخر اُس نے کوئی بات تو کی ہوگی نا؟

احمد — نہیں کچھ نہیں — رو رہی تھی
جب حسنی نے اس کو بتایا کہ وہ نغمہ گر ہے تو کہنے لگی کچھ سناؤ!
وہ حسنی بھی کیا منچلا تھا
سنانے لگا!

فیاض — اچھے وقت میں گانے کی سُوجھی تھی اُس کو!

احمد — یہ کوی اور راگی طبیعت کے بندے ہیں!

ہاں! پھر وہ عورت ــــ
وہ اپنی کہانی سنانے لگی تھی کہ اتنے میں اک شور اُٹھا
گھڑی بھر میں جنگل چیخنے لگا
آگ میلوں تلک بڑھ چکی تھی
وہ اس شور کو سُن کے جنگل میں بھاگی
مرا گھوڑا آگے نہ چلتا تھا
مَیں رہ گیا اور حسنی ہَوا ہو گیا
سارے جنگل میں ڈھونڈا
وہ دونوں نہ جانے کہاں کھو گئے تھے؟
سواروں نے بھگدڑ مچائی تھی
پھر کیا ہُوا یہ نہ پُوچھو
وہ ناری خدا جانے غائب ہُوئی، جل بُجھی، بھاگ نکلی
خدا جانتا ہے۔

فیاض ــــ وہ بزدل پھر گاؤں چھوڑ کے کیوں بھاگا تھا؟

احمد ــــ کوئی کہتا ہے عبدل وہیں جل گیا
کوئی کہتا ہے یہ جھوٹ ہے وہ کسی دوسرے گاؤں میں تھا
مگر یہ مجھے علم ہے یا خدا جانتا ہے
کہ حسنی مرے ساتھ تھا
وہ تو ناحق ہی مارا گیا!
مَیں نے لوگوں کو روکا بڑی منتیں کیں
وہاں کچھ بھلے لوگ بھی تھے
وہ کہتے رہے کہ عدالت کا دَر کھٹکھٹاؤ
مگر ایسے بلوے میں کب کوئی سُنتا ہے

بُڈھا تو غصّے میں اندھا تھا
بس دونوں لڑنے لگے اور وہیں کٹ مرے!

(عبدل سوچتا ہے۔ اسے طرح طرح کے خیال آوازیں دیتے ہیں)

عبدل — سُورج پُور اب پھر نہ بسے گا!
سُورج پور اب پھر نہ بسے گا
سُورج پور تو اُس دن اُجڑ گیا تھا!
وہ دن اپنے گاؤں کی بربادی کا دن تھا!

.. ..

آواز — کنج گھر میں چاند اُترا ہے
دروازے کیوں بند پڑے ہیں؟
کس نے بند کیے ہیں؟
نندی تم یہاں کیوں آئی ہو؟

.. ..

نندی — مجھے خوف آتا ہے عبدل
وہ کھڑکی کے شیشے تڑخنے لگے ہیں!
لہُو گِر رہا ہے

.. ..

اکبر — یہ کنج گھر میں لہُو کی بارش کہاں سے آئی!
سفید شیشوں پہ لال تحریر کس نے لکھی؟

.. ..

آواز — یہ آیا تجھے آج کس کا خیال؟
ہرے بن میں کلیاں کھلیں لال لال

.. .. ..

حسنی — گگن سے اُڑ کے دھرت پہ آیا کیسے رنگ گلال
اُجلے چِٹے چِٹے شیشے سارے ہو گئے لال لال

.. ..

بِنیا باجے تنا نوم تنا نوم
جھانجھن بولے چھن
بہت بڑی سرکار ہے تیری سیّد قطب الدّین

.. ..

آواز — اب اس پیڑ سے اُڑ جا!
اب اس پھل میں رَس نہ پڑے گا
اس کو اندر سے کیڑوں نے چاٹ لیا ہے
اب اس پیڑ سے اُڑ جا
کڑوے نیم کی ٹہنی چُن لے!

.. ..

فیاض — اب تو یہی تمنا ہے بس
نئے شہر میں جلدی جلدی گھر بن جائے
احمد — آٹھ بجنے لگیں تو بتانا
تمہیں کنج گھر کا نظارہ دکھاؤں گا
گاڑی وہیں سے گزرتی ہے
فیاض — آٹھ بجنے میں چند منٹ ہیں!
آواز — سُورج پُور اتر دگے عبدل!
وہاں نہ جانا!
عبدل — گاڑی آگے کو چلتی ہے
چیزیں پیچھے کو ہٹتی ہیں

ساری دھرتی گھوم رہی ہے
کھڑکی کے اُجلے شیشے میں چاند بھی جم کر ٹھہر گیا ہے

آواز —— سُورج پورا اُتر د گے عبدل!
وہاں نہ جانا!
وہاں ترا اب کوئی نہیں ہے!

عبدل —— اس دھرتی سے میرا ناطہ ٹوٹ چکا ہے!
اپنے وقت کا اِک اِک ساتھی چھوٹ چکا ہے!

آواز —— مَیں نہ کہتا تھا کہ وہ گھوڑا بڑا منحوس ہے
وہ زمیں منحوس تھی وہ آسماں منحوس تھا
.. ..
تجھ کو اِس دِن کے لیے پالا تھا عبدل!
پُوت کاہے کو جنا تھا سانپ تھا!

آواز —— تُو نے نندی کو مارا ہے!
تُو نے اس کا خُون پیا ہے!
تُو نے حسنی کو مارا ہے!
تُو اپنے ماں باپ کا قاتل!
تُو ہی مُنّھے کا قاتل ہے
اتنے تن داروں کا خُون تری گردن پر!
تُو خُونی ہے!
تُو قاتل ہے!

عبدل —— تو جھوٹا ہے
نندی اپنی موت مری ہے
حسنی میرا جگری دوست تھا

آواز ـــــ تُو بُزدِل ہے!
تُو نے سُورج پُور کو اجاڑا!

عبدل ـــــ تُو جھوٹا ہے!
تُو بُزدِل ہے!

آواز ـــــ تُو خُونی ہے!
تو قاتل ہے!
تو بُزدِل ہے!

عبدل ـــــ (لہجہ بدل کر)
دُھوپ کی گرمی سے پیلا پڑ گیا تھوہڑ کا کانس
چاند کی کبریت سے جلنے لگے جنگل کے بانس

.. ..

ارے کیا ہُوا دیکھنا تو!!
یہ گاڑی کھڑی ہو گئی؟

فیاض ـــــ (عبدل کی طرف دیکھ کر) کون سا اسٹیشن ہے بھائی؟
آپ یہاں اُتریں گے صاحب؟

احمد ـــــ نہیں! یہ تو جنگل ہے!
گاڑی یہاں کیوں رُکی!
کوئی آواز بھی تو نہیں!
کوئی بتّی نہیں!
یہ تو جنگل ہے! سنسان جنگل!!